www.shibliinternational.com

مارچ 2020 March

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

جلد:Vol3_شمارہ Issue25

مارچ Mar :2020

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202 Bank: SBI
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ

Mob: 9392533661 - 8317692718

Email: sadaeshibli@gmail.com

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli, Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	عہد جدید کا ایک تبدیلی ساز مفکر سید جمال الدین افغانی.....	پروفیسر انور معظم	۷
۴	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۴)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۱۱
۵	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۵
۶	دلتوں کی سماجی زندگی کا ترجمان ''اردو ناول دویہ بانی''	ڈاکٹر عبدالقدوس	۱۷
۷	حافظ شیرازی اور غالب دہلوی کا مختصر تقابلی مطالعہ	سلیمان زارع	۲۲
۸	غزل	افتخار راغب	۲۵
۹	خواتین قلمکاروں کی کہانی (خودنوشتوں کا مطالعہ)	صالحہ صدیقی	۲۶
۱۰	قطب شاہی دور میں فارسی تاریخ نویسی	محمد مختار عالم	۳۱
۱۱	ضیاء احمد بدایونی بحیثیت ناقد	محمد عامل بدایونی	۳۴
۱۲	ہمارا ملک	سید عظمت اللہ بیابانی	۳۸
۱۳	دواؤں کے پودوں کی اہمیت	نزاکت حسین	۳۱
۱۴	گاندھی جی اردو ادباء و شعراء کی نظر میں (تبصرہ)	مبصر: ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج

چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

کرونا وائرس۔ کرونا وائرس۔ اس لفظ کی صدا پوری دنیا میں گونج رہی ہے۔ عوام وخواص اس لفظ اور اس بیماری سے سہمے ہوئے ہیں۔ یہ ایسی بیماری ہے، جو عام بیماری نزلہ زکام، کھانسی، بخار سے مہلک بیماری کرونا وائرس کا روپ ڈھال لیتی ہے۔ دنیاوی ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق یہ بیماری عدم صفائی اور ناقص غذا کی وجہ سے متعدی (یعنی ایک سے دوسرے کو لگنا) بیماری وجود میں آئی ہے۔

مذہبی نقطہ نگاہ سے کوئی بھی بیماری متعدی نہیں ہوتی، بیماریوں اور مصائب وآلام کے اسباب، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ جو کچھ بھی تمہیں مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت ہیں، جس کی وجہ سے مخلوقِ خدا عذاب الٰہی میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''جب لوگ محصولِ مملکت کو اپنی دولت بنالیں گے۔ امانت، غنیمت اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھیں گے، اور غیر دین کے لیے علم حاصل کریں گے، اور آدمی اپنی بیوی کا کہنا مانے گا، اور ماں کی نافرمانی کرے گا۔ اپنے دوست کو آرام کو پہنچائے گا، اور اپنے باپ کو دور کرے گا، اور جب لوگ مسجدوں میں شور مچائیں گے، خاندان کا سردار فاسق شخص ہوگا، قوم کا رئیس ایک رذیل آدمی ہوگا، اور انسان کے شر سے ڈر کر لوگ اس کی تعظیم کریں گے، اور گانے والیاں، اور گانے بجانے کی چیزیں عام ہوجائیں گی، اور شراب کثرت سے پی جانے لگے، اور امت کے پچھلے لوگ اپنے پہلے والوں کو لعنت کریں گے، تو ایسی صورت حال میں لوگ منتظر رہیں، سرخ آندھیوں کے، اور زلزلہ آئے گا، خسف واقع ہوگا، صورتیں مسخ ہوجائیں گی، آسمان سے پتھر برسیں گے اور ان کے علاوہ اور علامتیں ہوں گی کہ جس طرح کسی ہار کا دھاگا توڑ دیا جائے اور موتی لگاتار گرتے چلے جائیں۔

اپنے گردوپیش پر نظر ڈالا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بالا علامتیں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اپنے اندر تبدیلی لائیں۔

دہلی میں ماہ گذشتہ جو فساد ہوا، آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی، ملک، مکان، دکان اور انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ یہ ملک ہندوستان اور انسانیت کے لیے بیحد شرمناک ہے۔ ادارہ اس سانحہ اور تشدد کی پرزور مذمت کرتا ہے اور مرکزی حکومت دہلی حکومت سے گذارش کرتا ہے کہ حقیقی مجرموں کو بلاتفریق مذہب وملت نیز پارٹی سے بالاتر ہوکر سخت سے سخت سزا دی جائے تاکہ اس طرح کے فساد کا اعادہ نہ ہو۔

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کی دوسالہ کامیاب اشاعت پر مبارکباد دینے والوں کا ادارہ شکرگزار ہے۔ امید ہے کہ حسب سابق آپ کا تعاون جاری رہے گا۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

حسن معاملہ:

اگرچہ غایتِ فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے، یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپؐ کی زرہ من بھر غلہ پر ایک یہودی کے ہاں گروی تھی، لیکن ہر حال میں حسنِ معاملت کا سخت اہتمام تھا، مدینہ میں دولت مند عموماً یہودی تھے اور اکثر ان ہی سے آپؐ قرض لیا کرتے، یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے ہیں، آپؐ ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے۔

(نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپؐ کے تاجرانہ تعلقات تھے، انہوں نے ہمیشہ آپؐ کی دیانت اور حسنِ معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لیے قریش نے متفقاً آپؐ کو امین کا خطاب دیا تھا، نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض و کینہ کے جوش سے لبریز تھے، تاہم ان کی دولت کے لیے مامون مقام آپؐ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائبؓ نام کے ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہوکر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپؐ سے ان کا تعارف کرایا، آپؐ نے فرمایا ''میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں'' سائبؓ نے کہا ''میرے ماں باپ فدا، آپؐ میرے ساجھی تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا)۔

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں، چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا، آپؐ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرض ادا کردیں، انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں، جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسولؐ اللہ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو، بولا ہاں، رسول اللہؐ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے، آنحضرت ﷺ نے یہ جملے سنے تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے۔

ایک دن ایک بدّو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخ پر اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تجھ کو خبر ہے تو کس سے ہم کلام ہے، بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے، کیوں کہ اس کا حق ہے (قرض خواہ کو بولنے کا حق ہے، اس کے بعد صحابہؓ کو اس کا قرض ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا)۔

ایک غزوہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ ہم رکاب تھے، ان کی سواری میں جو اونٹ تھا سست رو تھا اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہوگیا تھا، آپؐ نے اونٹ ان سے خرید لیا اور دام کے ساتھ اونٹ بھی ان کو دے دیا، کہ دونوں تمہارے ہیں۔

(یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو، انہوں نے دی، آپؐ نے اس سے اونٹ کو مارا تو وہ اس قدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا، پھر آنحضرت ﷺ نے ان سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک ان کا سواری کا حق ہے، مدینہ پہنچ کر جابرؓ بن عبداللہ نے قیمت طلب کی، آپؐ نے بلالؓ سے فرمایا کہ ان کو قیمت چار دینار اور اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو، چنانچہ حضرت بلالؓ نے چار دینار پر ایک قیراط سونا اور زیادہ دیا۔

پروفیسر انور معظم۔حیدرآباد

عہدِ جدید کا ایک تبدیلی ساز مفکر سید جمال الدین افغانی
ایک تعارف

پچھلے دو سال سے دو سوال عالم اسلام کی..... کا محور رہے ہیں۔ (۱) اسلامی حکومتوں کا زوال اور انتشار کیا مذہب اسلام کی کمزوریوں سے کوئی تعلق رکھتا ہے؟ (۲) کیا اسلام موجودہ سائنسی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بھی ہے؟ اگر اس مذہب میں ہر زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے تو پھر گذشتہ چار پانچ صدیوں میں سیاست، تہذیب اور فکر کے میدانوں میں اسلام کی کارکردگی کیوں معطل رہی؟

شام، عراق، لبنان، تینوس میں قوم پرست تحریکوں کا آغاز، یہ سارے واقعات عالم اسلام کے مذہبی اور سیاسی انتشار کی غمازی کرتے ہیں۔ ان تحریکوں کا مطالعہ ایک حقیقت کو پوری طرح واضح کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ان تحریکوں نے اپنے کو مخصوص علاقوں کے اندر محدود رکھا اور اپنے وقت اور ماحول کے فوری تقاضوں کو پورا کرنا اپنا مقصد ٹھہرایا۔ ان میں سے کوئی تحریک یا کسی تحریک کا قائد ایسا نہیں اُٹھا جس نے تمام اسلامی ملکوں کے مسائل کو ایک دوسرے سے باہم مربوط کر کے حل کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان تحریکوں کو یا تو کامیابی ہی نہیں ہوئی یا ہوئی بھی تو ان کے اثرات دیرپا اور دوررس ثابت نہ ہو سکے۔

اس دور میں صرف ایک شخصیت ہمیں ایسی ملتی ہے جس نے اسلامی حکومتوں اور مسلمانوں کے اس زوال کی صحیح تشخیص کی اور اس کے علاج کے لیے نسخہ بھی زود اثر تجویز کیا۔ یہ سید جمال الدین افغانی کی شخصیت تھی۔ افغانی کا نام اتحاد اسلامی کی تحریک کے ساتھ وابستہ کیا جاچکا ہے۔ لیکن خود تحریک اتحاد اسلامی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی طرف سے کافی سخت تنقید کا نشانہ بنائی جاتی رہی ہے۔ عام طور سے افغانی کے بارے میں یہی فیصلہ دیا گیا کہ وہ ایک آتش بیان عام سطح کے لیڈر تھے جن کا مقصد اسلامی ممالک کو مغربی تسلط کے خلاف بھڑکا کر آزادی کی جد و جہد پر آمادہ کرنا تھا اور یہ مقصد پوری طرح ناکام رہا۔ افغانی کی زندگی کا یہ خلاصہ درست نہیں معلوم ہوتا اور نہ ایسا کہہ کر ان کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ افغانی کو ایسے محققین نہیں ملے جو ان کے مشن کی صحیح قدر متعین کر سکتے۔ ۱۸۹۷ء میں ان کی موت کے بعد پچھلے چند سالوں تک افغانی کو ایک ناکام سیاسی رہنما سے بڑھ کر اور کچھ نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ افغانی کی شخصیت کے اندر کئی پہلو ایسے ہیں جن کا اب تک ایک خاطر خواہ مطالعہ کیا گیا نہ انہیں سامنے رکھا گیا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ عالم اسلام میں..... تجدیدیت اور قومیت کی جیسی تحریکیں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتداء سے صورت پذیر ہونی شروع ہوئیں کم وبیش ان سب کا آغاز افغانی ہی کی اصلاحی فکر سے تخلیقی رشتہ رکھتا ہے۔

افغانی نے پہلی بار عالم اسلام کو ''اسلامی قومیت'' کا نعرہ دیا۔ یہ وہ نعرہ تھا جس نے مختلف اسلامی ملکوں میں اٹھنے والی تحریکوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنے کی دعوت دی۔ اس نعرے کو ان مغربی ممالک کے سامنے بلند کیا گیا تھا جو رفتہ رفتہ مشرق وسطیٰ میں اپنے پنجے گاڑ دینے کی تدابیر پر عمل کرنے لگے تھے۔

بقول کینٹول اسمتھ افغانی نے پہلی بار عالم اسلام کے لیے بڑھتے ہوئے مغربی تسلط کے خطرے کو پہچانا اور اس سے سب کو خبردار کیا۔ ان کی تقریروں اور تحریروں کا اسلوب وہی ہے جو بعد میں چل کر مولانا آزاد کے ''الہلال'' کے مضامین کی جان بن گیا۔ مسلمانوں کے ماضی کا تذکرہ، اس کا موجودہ پستی سے مقابلہ، مسلمانوں کے صحیح مقام کی یاددہانی اور ان تمام باتوں کو خالص خطیبانہ، جذباتی اتار چڑھاؤ اور مرعوب کن لب و لہجے کے ساتھ ادا کرنا افغانی کا مخصوص اسلوب ہے۔ افغانی نے چند ہی برسوں میں پورے مشرق وسطیٰ کو اپنا ہمنوا بنالیا اور ان کے خیالات کی گونج، ایران، ترکی، مصر اور دیگر اسلامی ملکوں کی تحریکوں میں سنائی دینے لگی۔

"The task before the modern Muslim is, therefore, immense. He has to rethik the whole system of Islam without completely breakig with the past. Perhaps the first Muslim who felt the urge of a new spirit in him was Shah Waliullah of Delhi. The man, however, who fully realized the importance and immensity of the task and whose deep insight into the innter meaning of the history of Muslim thought and life, combined with a broad vision engendered by the wide experience of man and manners, would have made him a living link between the past and the future, was Jamal al-Din Afghani. If his indefatigable but divided energy could have devouted itself entirely to Islam as a system of human belief and conduct, the world of Islam, intellectually speaking, would have been on a much more solid ground today."

افغانی کو بھی انہی معنوں میں ایک ''مفکر'' کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے مذہبی، اخلاقی اور سماجی تصورات کو انیسویں صدی میں ایک ایسے ذہن کی شکل میں پیش کیا جو پچھلی صدیوں کے خیالات اور تجربات کو تبدیل شدہ حالات کے آئینے میں دیکھتا ہے اور اپنے کو ان تبدیلیوں کے لیے تیار کرتا ہے جو مستقبل کے بطن سے رفتہ رفتہ ظہور میں آنے والی ہیں۔ افغانی ان معنوں میں مفکر ہیں کہ انہوں نے گذشتہ اسلامی فکر کو اساس بنا کر اپنے عہد کی ضروریات کا ایک حل پیش کیا اور اپنے عہد کی چند اہم شخصیتوں کو متاثر کیا۔ صرف یہ امر کہ افغانی چند قابل ہستیوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے، افغانی کا مقام متعین کرنے کے لیے کافی نہیں۔ فیصلہ تو ان کی تحریروں ہی پر کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان میں کوئی مربوط فکر اور مستحکم زاویہ نظر مل جائے، تب کوئی بات یقین سے کہی جاسکتی ہے۔

افغانی کے تصورات ان کی تمام تحریروں میں، جو بہت کم ہیں، پوری بلاغت اور شدت اثر کے ساتھ موجود ہیں۔ افغانی کا قول تھا کہ ''میں کتابیں نہیں لکھتا۔ زندہ کتابیں تصنیف کررہا ہوں''۔

فکر کے راستے پر افغانی ایک عام انسان کی طرح سفر شروع کرتے ہیں جو اپنی فطرت کے مطابق دیکھتا سنتا اور اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اخلاقی اور سماجی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھتا اور ان سے نتیجے اخذ کرتا ہے۔ آغاز سفر کرنے

والا یہ انسان کوئی مثالی کردار نہیں جو غیر معمولی ذہانت اور مافوق الفطرت صلاحیتیں رکھتا ہے، بلکہ عام لوگوں کی طرح اس دنیا میں وہ چند جوہر لے کر آیا ہے جو اس نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں پائے ہیں یا اپنے ماحول سے اخذ کیے ہیں۔

انسان:

''انسان پیدائش کے وقت ایک ہیولا ہے بے شکل، ایک مادہ ہے بے نقش۔ اور اس کے ماں باپ، عزیز و اقارب اپنے خیالات، تصورات، اخلاق، آداب، وقت کے ساتھ ساتھ اس نو وارد کے حوالے کرتے جاتے ہیں۔ خود اپنی پسند کے نقش اس کے ذہن پر ثبت کر دیتے ہیں۔ اسے اپنیرنگ میں رنگ لیتے ہیں اور تمام امور میں اسے اپنے جیسا بنا لیتے ہیں۔''

لیکن صرف ماحول ہی اس کے کردار کا خالق نہیں۔ افغانی انسانی عقل کو کردار سازی میں سے اہم امر فیصلہ کن عنصر قرار دیتے ہیں۔

''انسانی اعمال میں سب سے افضل امر راہ سعادت میں فکر اور علوم و معارف میں نظر کا استعمال کرنا ہے''۔

افغانی انسان کو عقل کے سبب اپنے افعال کا آپ ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

''جس طرح خدائی قانون کے مطابق مزاجوں پر غذاؤں، دواؤں اور موسموں کا اثر نمایاں ہوتا ہے اسی طرح حکمت خداوندی یہی ہے کہ انسان کا ہر عمل بھی انسان کی ہیئت اجتماعی پر باقاعدہ اثر انداز ہوتا ہے''۔

اخلاقی نظام:

فطری نظام کی جس طرح کائنات پابندی کرتی ہے، اسی طرح ایک اخلاقی نظام بھی وجود رکھتا ہے جس کی پابندی کے لیے ایک باشعور انسان مجبور ہے۔ اس اخلاقی نظام کا مقصد افراد کی بہتر نہیں بلکہ معاشرے کی بہبود ہے۔ چنانچہ وہ ان اخلاقی اصولوں کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''ان اصولوں میں سے ہر ایک محض انفرادی تحفظ اور بقا کے لیے ضروری نہیں بلکہ حیات اجتماعی، ضروریات وحشیت کی تکمیل اور اکتساب زندگی کے لیے اعضاء و آلات کی حیثیت رکھتا ہے''۔

یہاں افغانی انسان کی سماجی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ فرد کی زندگی معاشرے کی حیات کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اگر کل معاشرے کی موت سے تحفظ کا حصول ممکن ہو جائے تو ہر فرد کی موت کا تحفظ بھی ہو سکتا ہے۔ یہیں آ کر اخلاقی نظام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو فرد کی فطری حیثیت اور سماجی حیثیت میں توازن قائم کرنے والی قوت کا دوسرا نام ہے۔

افغانی کے تصور اخلاق میں ہمیں ایک چیز ملتی ہے جس کی ایک مذہبی رہنما سے قطعی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ یہ کہ افغانی کسی روحانی بنیاد پر اخلاقی اصولوں کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان کا نقطہ نظر بڑی حد تک مادی مفکروں سے میل کھانے لگتا ہے۔ اخلاقی قدروں کے متعلق افغانی کا تصور یہ ہے کہ وہ معاشی حالات اور سماجی مقامات کی مطابقت کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں بااخلاق بننا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے مصیبت میں سہولت اور مادی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اچھی صفات کو اس لیے اختیار نہیں کیا جاتا کہ وہ بذات خود اچھی ہوتی ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ مادی مفادات کی ضمانت دلاتی ہیں۔ اخلاق کے مجرد تصور کو ٹھکرا کر افادی نقطۂ نظر اختیار کرنا افغانی کی منفرد فکر کا ایک اہم پہلو ہے۔ جب اخلاق کی بنیاد عقل اور معیشت پر رکھ دی جائے تو عقل کے معیار اور معیشت کے وسائل کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بھی بدلتی رہیں گی۔ نہ صرف مختلف معاشروں میں بلکہ ایک معاشرے کے مختلف طبقات میں بھی۔

سماجی مسائل:

اخلاقی تصورات کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل پر

افغانی کا اظہار خیال بھی ان کی منفرد سوچ کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ افغانی کے نزدیک انسان کو حیوانوں سے ممتاز کرنے والی شے اس کا سماجی احساس ہے۔ اسی کو بعد میں چل کر ''قومیت'' کا نام دیتے ہیں۔ احساس قومیت افغانی کی فکر میں بہت اہم درجہ رکھتا ہے اور وہ اس احساس کو کسی قوم کی ترقی کے لیے بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قومیت ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو ''معلم'' افراد میں اپنی تعلیم و تربیت سے اس طرح بیدار کر دیتا ہے کہ ایسے تربیت یافتہ افراد قوم کے لیے اپنی روح تک بیچنے کو سہل جانیں اور اپنی عزت قوم کی عزت سمجھیں''۔

تعلیمی تصورات:

افغانی کے تعلیمی تصورات میں ہم ایک ایسے مصلح کی جھلک دیکھتے ہیں جس نے پہلی بار مسلمانان عالم کو جدید سائنسی تعلیم کی شدید کمی کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے تعلیمی نصاب میں علوم اسلامیہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کیمیا، طبیعات، نباتات، ریاضی، علم ہندسہ وغیرہ پر بھی پورا پورا زور دیا گیا ہے۔ افغانی ان قدامت پرست، روایتی مذہبی علماء میں سے نہیں جو قومی احیاء کے لیے صرف عقائد کی درستی یا عبادات کی پابندی کی تلقین ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ افغانی جس قدر دین دار ہیں، اسی قدر دنیادار بھی ہیں۔ وہ تمام تہذیبی کمالات اور معاشی خوشحالیوں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ دنیا کی راحتوں میں پوری طرح لذت دینے والے مادیت پرست کی طرح وہ کہتے ہیں:

''معیشت میں کمال اور زندگی میں رفاہیت کمال عقل و نفس کے لیے شرط اعظم ہے۔ یہی اولین سبب ہے انسان کی حرکات عقلیہ اور اسے دائرہ حیوانات سے باہر نکالنے کا۔ یہی بزرگ ترین موجب ہے قبائل اور امم کا بدوبت اور وحشت کی حالت سے تہذیب و تمدن کی طرف انتقال کا۔ یہی علت اول ہے معارف کے انتشار، علوم کی ایجاد، صنائع کے اختراع اور حرفت کے ابداع کی''۔

فلسفہ:

مختلف علوم انہی تہذیبی ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع ہیں۔ ان علوم میں فلسفے نے افغانی کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ فلسفے کی اہمیت اور اس سے آشنائی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بعض وقت افغانی اسے مذہب سے ٹکرا دیتے ہیں اور ایسے فرائض اس کے سپرد کر دیتے ہیں جو مذہب کے دائرہ میں سمجھے جاتے ہیں:

''فلسفہ کے ذریعے اخلاق فاضلہ اور محرکات رذیلہ میں تمیز کی جاسکتی ہے، تاکہ اول الذکر سے اپنے آپ کو زینت دے اور مؤخر الذکر سے اپنے آپ کو بچا کر نفسیاتی کمال حاصل کیا جاسکے''۔

نہ صرف انفرادی طور پر فلسفے کا مطالعہ ضروری ہے بلکہ پوری قوم میں ایک ''فلسفی روح'' جاری و ساری رہنی چاہیے۔

''اگر کسی قوم میں حقیقی فلسفی روح پیدا ہو جائے چاہے اس قوم میں ان علوم کا پتہ بھی نہ ہو جن کے موضوع خاص ہیں۔ بلا شبہ یہی فلسفی روح ان تمام دوسرے علوم کے حاصل کرنے کی دعوت دے گی''۔

اگر یہ احساس جسے وہ ''فلسفیانہ روح'' سے تعبیر کرتے ہیں موجود نہ ہو یا اس میں کمی یا کسی قسم کا نقص پیدا ہو جائے تو پھر وہ قدر مشترک غائب ہو جائے گی جو علوم سے استفادے کو ممکن بناتی ہے۔ جب علوم کی قدریں متاثر ہو جائیں تو اس قوم کی تہذیب اور تمدن کی بنیادیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ افغانی کے نزدیک فلسفہ نہ صرف انفرادی فکر کی آرائش کرتا ہے بلکہ بہ حیثیت مجموعی کسی قوم کی تہذیب کو سنوارتا، منظم کرتا اور آگے بڑھاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

مولانا آزاد کا نوٹ:

''یہ جملہ کس قدر صریح غلط و تہمت محض ہے۔ مؤلف کا پورا مبحث بھی محض مغالطہ ہے۔ فقہ حنفی اور مذہب محدثین وائمہ حدیث کے اختلاف کو احکام شریعت کے مطابق عقل وعلل ہونے نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ طحاوی کی تصنیف کا یہ مقصد ہے اور نہ نظر و درایت سے ان کا یہ مقصود ہے جو مؤلف نے بتلایا ہے''۔(ایضا)

اسی طرح کی سیرۃ النعمان اور مضامین عالم گیر سے کئی مثالیں نقل کی گئی ہیں۔

حیات شبلی پر بھی مولانا آزاد کے حواشی ہیں۔ ایک مثال اس کی بھی یہاں درج کی جاتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے رسالہ ظل الغمام کی ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے قلم میں علی گڑھ جانے سے پہلے انشا پردازی کا زور موجود تھا''۔(ایضاص ۱۷) اس پر مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:

''بھلا اس رسالہ کی عبارت کو انشا پردازی سے کیا مناسبت ہے''۔(ایضا)

اسی طرح سید صاحب نے علامہ کے عقد ثانی کا حیات شبلی میں جہاں ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ عقد ثانی کا یہ ارادہ ان کے صاحبزادے حامد حسن کو ناگوار گذرا اور وہ چپکے سے لاپتہ ہو گئے۔ مولانا آزاد نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ''اس لئے کہ پہلے یہ رشتہ خود حامد کے لئے تجویز ہوا تھا''۔(ایضاص ۱۷)

ہم نے مذکورہ بالا مثالیں بطور نمونہ نقل کی ہیں ان کا تجزیہ مقصود نہ تھا تاہم آخر الذکر کے حاشیہ کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور نہ اس زمانہ میں مولانا آزاد علامہ شبلی کے عالم السرائر تھے۔

آخر میں سید مسیح الحسن نے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی سے مولانا آزاد کے گوناگوں تعلق اور عقیدت مندانہ جذبات کی مثالیں دی، پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام کے خطوط سے اقتباسات پیش کر کے دونوں کے باہمی محبت آمیز تعلقات کی داستان لکھی ہے۔ پھر مولانا شبلی کے متعلق مولانا آزاد کے تاثرات نقل کئے اور کئی اقتباسات درج کئے، آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی کا ایک اقتباس ملاحظہ:

''ہر وقت مولانا مرحوم سے یکجائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر تھا، جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا، اسی وقت چائے کا دور چلتا، طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی وادبی تذکروں میں بسر ہوتا، حقیقۃً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف وکیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ دفن ہو گئے، وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پر لطف صحبت تھی جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ ان کا علمی ذوق جو وسیع اور ہر وادی میں تھا ان کے

ساتھ ہی مدفون ہوگیا''۔(ایضاص ۷۷۔۷۸)

سید مسیح الحسن مرحوم نے مولانا آزاد کا ایک اور اقتباس نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے:

''فی الحقیقت مولانا کی ذات نوع بہ نوع کمالات کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں سرتاسر بے مغز و پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گذرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بدل نہ ہوتی ہو۔ وہ کیا گئے کہ علم وفن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہوگیا۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طالب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی تھی''۔(ایضاص ۷۸)

مولانا آزاد کے اس طرح کے اور بھی کئی اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، مولانا آزاد کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی کے بھی اقتباسات نقل کئے ہیں، خود علامہ شبلی کے ایک خط کا بھی مقدمہ نگار نے اقتباس دیا ہے، طوالت کے سبب ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ آخر میں سید مسیح الحسن نے خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ:

''یہ عقیدت، یہ خلوص، یہ قربت مولانا شبلی اور مولانا آزاد کے درمیان تھی اور اسی کی بنیاد پر اہل قلم، مفکرین اور ناقدین نے ان دونوں عظیم ہستیوں کے باہمی شخصی اور علمی روابط کا جائزہ لیا ہے۔ بلاشبہ یہ تصویر کا برادلکش اور حسین رخ ہے مگر اس سے مولانا آزاد کی تصویر کے اس دوسرے رخ کا اندازہ نہیں ہوگا جو ان کے حاشیوں کی تحریروں سے ابھرتا ہے۔

علمی مباحث میں مخالفت یا تردید کوئی عیب نہیں ہے لیکن طریق اختلاف اور طرز تخاطب جو مولانا آزاد نے ان حاشیوں میں روا رکھا ہے وہ بظاہر پبلک کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے ہرگز اختیار نہ کرتے۔ ایسی چند مثالیں انانیت اور طنز ومزاح کے مباحث میں پیش کی جاچکی ہیں''۔(ایضاص ۸۰)

اور حواشی ابوالکلام آزاد کی یہی حقیقت بھی ہے کہ وہ ذاتی فٹ نوٹ ہیں لیکن بہرحال علمی حیثیت سے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

رشید حسن خاں

رشید حسن خاں (۱۹۲۵۔ ۲۰۰۶ء) ہمارے عہد کے ممتاز ترین محقق ونقاد تھے۔ تحقیق اور خاص طور پر متنی تحقیق کے میدان میں انھوں نے جو کاوشیں کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور جو تاریخ ادب اردو میں سنہرے حرفوں میں لکھی جائیں گی۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی کو وہ اپنا معنوی استاذ تسلیم کرتے تھے اور انھیں کے نہج پر وہ تحقیقات کا آغاز کرتے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ متنی تحقیق میں رشید حسن خاں صاحب اس بلند مقام پر پہونچ گئے ہیں جہاں ان کے معنوی اساتذہ نہ پہونچ سکے تھے۔

رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ادبی زندگی کے آغاز اور پچیس سال کی عمر میں انھوں نے شبلی کی فارسی شاعری کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیا تھا جو مئی ۱۹۵۰ء کے نگار میں ''شبلی کا فارسی تغزل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے قدرے تفصیل سے شبلی کے جذبات اور احساسات کا تجزیہ کیا ہے اور کئی اور نقادوں کی طرح ان کی شاعری کو حافظ وسعدی سے جاملایا ہے۔ ان کے شاعرانہ جذبات کے مطالعہ میں وہ بھی بمبئی پہونچے ہیں لیکن داد سخن دی ہے اوروں کی طرح بات سے بات پیدا نہیں کی ہے، اپنے وسیع وعمیق مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ

''شبلی اپنے رنگ کے بے مثل فنکار ہیں، انھوں نے

اپنے اشعار میں احساسات وجذبات کی بے لاگ تصویریں پیش کی ہیں۔ ایسی تصویریں جو حسین ترین رنگوں سے مزین ہیں اور جن کے امتزاج میں انھوں نے اس مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے جو کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ پورا مجموعہ فارسی غزلیات کا پڑھ جایئے ایک شعر میں بھی اس حدیث شوق کے علاوہ کسی دوسری بات کا بیان نہیں ہوگا۔ یہی بات ان کے مذاق سلیم کی سب سے بڑی خوبی ہے''۔ (مقالات رشید خاں جلد اول ص ۶۷)

یہ مضمون بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز میں شائع ہوا پھر خاں صاحب نے بیس سال بعد شبلی کے مضامین کا انتخاب اس وقت کیا جب وہ ایک ممتاز متنی محقق کی حیثیت سے تسلیم کئے جا چکے تھے، انتخاب مضامین شبلی ۱۹۷۱ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا، یہیں سے ۱۹۹۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا، جو راقم کے پیش نظر ہے۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوگیا ہے۔

موازنہ کے متعدد محقق ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، رشید حسن خاں نے بھی اسے مرتب کیا ہے، جس کا ذکر راقم کی کتاب ''آثار شبلی'' میں شامل ہے۔ یہاں اس کے تعارف وتجزیے کی تفصیلات سے صرف کرتے ہوئے محض رشید حسن خاں کے دیباچہ کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ خان صاحب علامہ شبلی کی جامعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر یکساں دسترس رکھتے تھے، مستقل تصنیفات کے علاوہ ان کے مختلف مضامین کے مجموعے بھی اس پر گواہ ہیں۔ سیرت، سوانح، تنقید اور معقولات پر ان کی تصنیفات معروف ہیں، لیکن مضامین کے مجموعوں میں ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر نظر آتا ہے، مذہبیات اور اردو ہندی کی بحث، عربی کے نصاب کے مسائل، اسلامی تہذیب کے اہم عنوانات، قرآن پاک کے متعلق فکر انگیز مقالے، قدیم کتابوں پر مختصر اور مفصل تبصرے، ادبی مباحث، مستشرقین کی غلط کاریوں کی تردید، سیاسی افکار، غرض بیسیوں اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے، اور ہر جگہ ان کے مخصوص انداز تحریر کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، ذہن کس درجہ پر نکتہ رس تھا، نظر کیسی باریک تھی اور قلم میں کس قیامت کی توانائی تھی''۔ (تعارف، موازنہ انیس ودبیر ص ۵)

علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو قدیم صالح اور جدید نافع کا امتزاج ہے۔ وہ اپنے عہد میں اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے، اور ابتداء سے تھے، علی گڑھ پہونچنے کے بعد ہی ان کی تحریروں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے، علی گڑھ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا لیکن علی گڑھ تحریک نے بھی ان سے بہت کچھ حاصل کیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم ان کا یہی ارتقائی نظریہ ان کی علی گڑھ تحریک سے سولہ سالہ وابستگی کے باوجود انحراف کا باعث ہوا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تحریک ندوہ میں شمولیت اختیار کی اور یہی وجہ ہے کہ اخیر تک ان کا رشتہ علی گڑھ سے بھی استوار رہا اور اسی وجہ سے قدامت پرستوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے، رشید حسن خاں اس امتزاج کو شبلی کا بڑا کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے قدیم وجدید کے قصے کو اپنے ذہن پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ وہ قدیم کی عظمت کے قائل تھے لیکن اس کی کمزوریوں سے بھی باخبر تھے اور معترف بھی۔ وہ جدید کی اہمیت کو پوری طرح مانتے تھے لیکن اس سے مرعوب نہیں تھے۔ آج شاید اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکے گا، لیکن شبلی کے زمانے میں اس توازن کی بڑی ضرورت تھی''۔ (ایضاص ۵۔۶)

اس کے بعد خاں صاحب نے عہد شبلی پر روشنی ڈالی

ہے، قدامت پرستوں کی کمزوریوں اور جدید ذہن اور مغربیت کے سیلاب کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ ہمارے علماء کا کیا معیار تھا؟ معاشرے کا کیا حال تھا؟ مشنریاں کیا کر رہی تھیں؟ ایسے غیر معتدل ماحول میں شبلی نے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ لکھتے ہیں

''ایسے زمانے میں جب کہ یا تو مسائل سے بے تعلقی تھی یا تعلق تھا تو توازن کا پہلو دب گیا تھا، شبلی نے مذہبی مسائل اور سیاسی امور دونوں میں وہ انداز اختیار کیا جس میں توازن کا پہلو نمایاں تھا، وہ سرسید سے بہت متاثر تھے، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی تھا، اس کے معترف بھی تھے، لیکن بہت سے سیاسی اور مذہبی مسائل میں ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے، وہ مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے جاتے ہیں، لیکن یورپ کی علمی فیض بخشیوں اور اس کے احسانات کا اقرار بھی کرتے جاتے ہیں، وہ جدید تعلیم کی سطحیت سے خوش نہیں لیکن قدیم تعلیم کی عدم افادیت کے بھی اسی طرح قائل ہیں اور ندوے میں اس حد تک اصلاح کرنے کے درپے تھے جس کو پرانے خیال کے علماء برداشت نہیں کر سکے''۔ (ایضاص ۷)

اس کی اور بھی تفصیل انھوں نے لکھی ہے، شبلی کی وسعت ذہنی اور وسعت قلبی کا بھی ذکر کیا ہے اور قدیم وجدید کے سلسلہ میں ان کے نقطہ کی بھی وضاحت ہے، اس تجزیے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''اصلاح کا یہ جذبہ اور صاف گوئی کا یہ انداز شبلی کا قابل قدر عطیہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں نئی نسل کو بخشا، ان کے مضامین میں یہ سارے مباحث ومسائل محفوظ ہیں اور اسی لئے ان کے مضامین کی بڑی اہمیت ہے''۔ (ص ۸)

اور اسی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے ''انتخاب مضامین شبلی'' کو مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شبلی کی انشاپردازی کا ذکر کیا ہے اور اسے ایک مسلمہ اور متفق علیہ مسئلہ بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صاحب طرز انشاپرداز تھے، پھر انھوں نے معاصرین شبلی کے اسالیب بیان کی توضیح کے ساتھ اس میں شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے، پھر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس نقطہ نظر سے شبلی کے اسلوب اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی، سیاست، ادب، مذہب، تاریخ، فلسفہ وغیرہ بہت سے اطراف وموضوعات ان کی جولان گاہ تھے۔ وہ مولوی تھے، استاذ تھے، سیاسی مسائل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ ان کی سوانح کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کی تعیین کے لئے کافی ہوگا کہ پرجوش جذباتیت ان کے مزاج کا غالب عنصر تھا اور اس کے اثرات بھی نمایاں ہوتے رہتے تھے۔ ادب میں ہی نہیں عام زندگی میں بھی، مثلاً وہ سردیوں میں بھی بہت تیز برف کا پانی پینا پسند کرتے تھے اور شیرینی اس قدر زیادہ مرغوب تھی کہ میٹھی سے میٹھی چیز بھی کچھ کم میٹھی معلوم ہوتی تھی۔ (ایضاص ۹)

اس تجزیے سے انھوں نے شبلی کی انتہا پسندی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور حیات جاوید کا پرانا قصہ بیان کیا ہے، حالانکہ اس وقت آل احمد سرور تجزیہ کر کے لکھ چکے تھے کہ شبلی کو مصور پسند تھا اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی۔ لیکن رشید حسن خاں کی اس بات میں وزن ہے کہ حیات جاوید کی ہیرو پرستی سے نالاں شبلی خود بھی تو شخصیت بلکہ عظمت وسطوت کے خوگر ہیں، لیکن پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''شبلی کی شخصیت اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ وہ قدیم وجدید دونوں کی انتہا پسندیوں سے بیزار ہیں، تنگ نظری کے دشمن ہیں اور منطقیت کو تحریر وتقریر دونوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں''۔ (ایضاص ۱۰)

مولانا صدرالدین اصلاحی۔حیدرآباد

ایمان بالآخرت

تنہا توحید اس سے مطالبہ کرے گی کہ خدا کا حق پہچانو اور اخلاق وانصاف کا تقاضہ ہے کہ اس کے سامنے نہ حاضری دینی ہے اور نہ ہی اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے تو خواہ مخواہ اطاعت وبندگی کا یہ بارگراں اپنی گردن پر کیوں لادے پھروں؟ اسی طرح اگر قیام قیامت کا یقین اس سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں فلاں حدود کی پابندی کرو، وہ فوراً جواب دے گا کہ ''نیچر نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے فنا کرے گا اور وہی اس پوری کائنات کو بھی ایک روز تباہ کر کے رکھ دے گا، یہ بیچ میں ''اللہ تعالیٰ'' کون سی چیز ہے، جس کے کچھ حدود بھی ہیں، جن کی مجھے پابندی کرنی ہے؟'' اگر وہ وجودِ الٰہی کو مانتا ہوگا، مگر ساتھ ہی توحید کا قائل نہ ہوگا تو یوں کہے گا کہ ''اللہ خالقِ کائنات ہونا برحق، اس کا ربّ اعلیٰ ہونا بھی بجا اور قیامت کا آنا بھی یقینی، مگر یہ ارواح عظیمہ، یہ انبیاء علیہم السلام وملائکہ یہ بزرگانِ دین جن کی ہم نذریں چڑھاتے ہیں، جن کے آستھانوں اور مزاروں پر ہم سالانہ یا ماہانہ یا ہفتہ وار سجدے کرلیا کرتے ہیں اور جن کو خوش رکھنے کے لیے ہم کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے، یہ سب قیامت میں اعمال کا ترازو اٹھنے کب دیں گے اور ہمارے حساب کتاب کا دفتر کھلنے کیوں پائے گا، ان کی ایک سفارش ہماری بخشش کے لیے کافی ہوگی، اس لیے اللہ کے احکام اور حدود کی بحث سے ہمیں کیا بحث''۔

فکرِ آخرت سے بے نیازی کا سرچشمہ:

ایمان بالآخرت کی اس زبردست اہمیت کا تقاضہ ہے کہ اس کے لیے انتہائی مناسب اور موزوں تعمیری تدبیریں سوچی اور اختیار کی جائیں، مگر اس معاملہ میں نتیجہ خیز غور وفکر کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے منفی پہلو پر غور کرلیا جائے اور جان لیا جائے کہ آدمی بایں دانش وبینش فکرِ آخرت سے بے نیاز کیوں ہو رہتا ہے؟ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ اسے آنے والی غیر معمولی حالات کے اندیشوں سے چونکا دیا جاتا ہے۔ مگر بات اس کے کان کے پردوں سے آگے نہیں بڑھتی؟ دلائل کی تابنا کیوں میں اسے یوم حساب کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے، مگر اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے سے انکار کر دیتی ہیں؟ اللہ کا برہانی کلام اور پیغمبر کی حکیمانہ دعوت اس کو مختلف طریقوں سے یہ امر واقعی ذہن نشین کرانا چاہتی ہے کہ تیری زندگی بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد، ذمہ دار اور مسئول ہستی ہے، یہ زیست دنیا ہی تیری کل زندگی نہیں، بلکہ اس کا صرف ایک جزو ہے اور اس کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ اس کا دور آغاز ہے، اس دنیا میں تیری حیات کے لمحے بہت تھوڑے اور تیرے سانس شمار میں بہت ہی محدود ہیں، اصلی اور جاودان زندگی دراصل اس وقت کے بعد شروع ہونے والی ہے، جس کو تو اپنا آخری وقت گمان کئے بیٹھا ہے، اس اصلی اور مستقل زندگی کی بھلی یا بُری نوعیت کی تعین تیرے اس نقطۂ نظر اور طرزِ عمل سے ہوگی جو تو اس زندگی میں اختیار کرے گا، اگر تو اپنا بھلا چاہتا اور سرمدی خوش بختیوں سے شاد کام ہونا چاہتا ہے تو وہ راہ اختیار کر جو تجھے اس منزل تک پہنچا دے، یعنی اپنے رب کی مرضیات کا تابع ہو کر رہ، تو خود سوچ لے کہ تجھ سے یہ مطالبہ تیری اپنی بھلائی کے لیے کیا جا رہا ہے نہ کہ کسی اور کی، مگر یہ سارے وعظ وپند بس ہوا میں بکھر کر اور فضا

میں تحلیل ہوکر رہ جاتے ہیں اور وہ بدستور انکار کی مدہوشی میں مبتلا رہتا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر حقیقت واضح نہیں ہوتی اور دلائل اس کی آنکھیں نہیں کھول سکتے؟ نہیں جہاں تک قرآن کے مخاطبین کا تعلق ہے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ قرآن اگر کلام ربانی ہے تو اس کے اس دعوے کے باوجود کہ وہ تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَیْءٍ ''ہر امر دینی کو روزِ روشن کی طرح عیاں کردینے والا'' ہے یہ وہم کیسے کیا جاسکتا ہے؟ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ قرآنی شہادت کی رو سے وقوعِ قیامت کا معاملہ اتنا ثابت شدہ اور یقینی معاملہ ہے کہ اس کے اندر شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں وَاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا (کہف ۲۱) ''قیامت کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں''۔

اس کلام ربانی کے اندر تیقن کی جو شان ہے، اس پر نظر ڈالئے، بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک یہ ایک بدیہی مسئلہ ہے اور ہر گونہ قابلِ انکار۔ مگر منکر ہے کہ اس کی زبان روکے نہیں رکتی، پھر آخر اس انکار بے محابا کی وجہ کیا ہے؟ انکارِ آخرت یا آخرت فراموشی کا وہ کونسا سرچشمہ ہے جو قرآن کی اس تبینِ حقیقت کے باوجود خشک نہیں ہوتا اور برابر آخرت فراموشی کی جڑوں کو سیراب کئے چلا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سرچشمہ کا نام ہے دنیا پرستی اور حُب عاجلہ۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا (الدہر) ''حقیقت یہ ہے کہ لوگ حاضر (جو دنیا اس کے سامنے ہے) پر ریجھے ہوئے ہیں اور اس کے بالمقابل اس بھاری دن (قیامت) کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں'' بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (اعلیٰ) ''(بلکہ واقعہ یہ ہے) کہ تم لوگ دنیوی زندگی کو (آخرت کے مقابلہ میں) ترجیح دیتے ہو'' زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا (بقرہ ۲۱۲) دنیوی زندگی منکرینِ حق کی نگاہوں میں رچ بس گئی ہے'' بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ. وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (القیامہ) بلکہ تم لوگ عاجلہ (دنیا) کو سینے سے لگائے اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو'' بس یہ ہے ساری خرابیوں کی جڑ، یہ دنیا پرستی اور عاجلہ پسندی وہ بس گانٹھ ہے جو قلبِ انسانی کی رگوں میں حیوانیت کا زہر پیوست کردیتی ہے اور پھر اس کے فطری مزاج کو فاسد بنا ڈالتی ہے، جب تک کہ اس زہر سے اس کا دل پاک نہیں ہوگا، اس کے لیے بندگی کی راہ اختیار کرنی محال ہے۔ اگر وہ نام کا مسلم ہے تو پُر اثر سے پُر اثر مواعظ کی کوئی مقدار بھی اس کو حسنِ عمل پر آمادہ نہیں کرسکتی، خواہ وہ زبان سے امنا وصدقنا کی کتنی ہی گردانیں کیوں نہ گردان جائے، وہ اسلام کے صریح تقاضوں کو سنے گا اور اس طرح اغماض کرجائے گا گویا وہ اس کا سرے سے مخاطب ہی نہیں ہے۔ آپ اگر زیادہ اصرار سے کام لیں گے تو وہ معذورتیں کرے گا، پھر تاویلوں کی نقاب منہ پر ڈال لے گا اور بدرجہ آخر انتہائی جسارت کے ساتھ اسے اسلام کی صحیح تعبیر اور اس کا واقعی تقاضہ ماننے ہی سے انکار کردے گا۔

اسی طرح اگر وہ غیر مسلم ہے جو جزا سزا کا قائل ہے تو وہ قرآن کی دعوت پر ایمان لانے کی ہرگز توفیق نہ پائے گا، اس لیے کہ اس کے اندر آخرت کی فکر اتنی مستحکم اور بیدار نہیں ہے جو اسے تحقیقِ حق پر سنجیدگی سے متوجہ ہونے کے لیے تیار کردے اور اپنے آبائی دین کے ساتھ جو تعلق خاطر رکھتا ہے اسے فلاحِ آخرت پر قربان کردے۔ اور اگر وہ ایسا منکرِ اسلام ہے جو منکرِ قیامت بھی ہو تو اس پر دلائلِ قیامت ہرگز کارگر نہیں ہوسکتے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جس چیز سے محبت کرتا ہے، اس کی مخالف چیزوں کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ ایمان بالآخرت اور دنیا پرستی میں کھلا ہوا تضاد ہے، ایک شے کا وجود دوسری کے وجود کا دشمن ہے، اس لیے جو قلب ہوائے نفس کا نشیمن ہوگا، فکرِ آخرت کا طائر قدر اسے اپنا آشیانہ نہیں بنا سکتا۔

ڈاکٹر عبد القدوس۔اسسٹنٹ پروفیسر اردو گورنمنٹ ڈگری کالج حسینی علم حیدرآباد

دلتوں کی سماجی زندگی کا ترجمان ''اردو ناول دویہ بانی''

اردو کی ادبی روایت دلت ادب سے یکسر خالی ہے اور اردو کے افسانہ نگار و ناول نگار اس بات سے یکسر بے خبر ہیں کہ دوسری زبانوں بشمول ہندی میں دلت ادب کی روایت خاصی مستحکم ہو چکی ہے۔ یہ وہ الزام یا غلط تاثر ہے جو دلت ادب اور اردو کے تعلق سے عام ہے۔ دراصل ہم کبھی کبھی خود ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ دوسروں کی رائے ہمارے بارے میں صحیح ہے۔ دلت ادب اور اردو کے تعلق سے بھی یہی ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ہندی میں یا چند دوسری ہندوستانی زبانوں میں دلت ادب ایک اہم عصری تخلیقی رجحان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، دلتوں کے مسائل پر ناول اور افسانے لکھے بھی جا رہے ہیں اور ان پر ادبی حلقوں میں بحث بھی جاری ہے۔ لیکن پورے ادبی منظر نامے سے اردو کے افسانوی ادب کو بے دخل کر کے مطمئن ہو جانے والوں کے علم میں یہ آنا ضروری ہے کہ جن دلت مسائل کی ادب میں عکاسی کی بات زور و شور سے کہی جا رہی ہے ان پر دو انتہائی کامیاب اور فنی نقطۂ نظر سے انتہائی طاقتور افسانے اردو میں پریم چند نے نجات اور کفن کے نام سے ۱۹۳۶ء سے پہلے ہی لکھے تھے۔ دنیا کے افسانوی ادب کے سخت ترین انتخاب میں بھی شامل ہونے والا افسانہ کفن دلت مسائل پر اب تک کا شاہکار افسانہ ہے، اور ظاہر ہے کہ پریم چند کا یہ افسانہ اردو زبان کا افسانہ ہے۔ اگر پریم چند کو ہندی ادیب مان بھی لیا جائے تو بھی بحیثیت اردو افسانہ و ناول نگار ان کا مقام محفوظ رہے گا۔ اب جب کہ پریم چند اردو کے ادیب ہیں اور ان کا افسانہ کفن اردو کا افسانہ ہے تو پھر یہ کہنا کہ اردو میں دلت ادب کی روایت موجود نہیں ہے، نظر ثانی کا مستحق زیادہ ہے توجہ کا کم۔ افسانے سے قطع نظر اگر ہم ناولوں کی بات کریں تو بھی کسانوں، مزدوروں اور اچھوتوں کو مسائل سے اردو کا دامن خالی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا عصری ادبی منظر نامہ اسی سلسلے میں زیادہ توجہ چاہتا ہے، اور غضنفر کا ناول دویہ بانی اسی ضرورت کی تکمیل کا حرف آغاز ہے۔

لفظ دلت، اچھوت، اور ہریجن ایک ہی طبقے کے مخصوص نام ہیں یہ طبقہ اس غیر انسانی طبقاتی نظام کے بطن سے وجود میں آیا ہے جو ہندوستان میں آریاؤں نے قائم کیا تھا انسانی سماج کے ایک بڑے حصے کو اچھوت قرار دے دیا گیا اور محض اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اسے ناپاک قرار دے کر، تمام مذہبی امور سے بھی الگ کر دیا گیا۔ اب یہ طبقہ نہ تو عبادت گاہوں میں جا سکتا تھا، نہ ہی ایشور کی اپاسنا کر سکتا تھا اور نہ مذہبی کتابوں کو پڑھ سکتا تھا جس میں زندگی گزارنے کے اصول بتائے گئے تھے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں رما شنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں۔

''ادنیٰ طبقہ کے لوگ باقی ہندوؤں سے الگ زندگی گزارتے ہیں، ہندو پجاری نہ ان کے گھر میں مذہبی رسومات ادا کرتا ہے اور نہ ہی انھیں اپنے مندر میں داخل ہونے دیتا ہے..... اچھوت اور غیر اچھوت کے درمیان جو سماجی تقسیم ہے ایسی تقسیم دیگر کسی بھی دو اقوام میں ملنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

ظاہر ہے کہ مذہبی شعائر سے علیحدگی اور عبادت گاہوں میں جانے پر روک جیسے عوامل انسانی فکر و احساس کو جس

قدر ضرب پہنچاتے ہیں وہ ایک اہم ترین سماجی مسئلہ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ غضنفر کے ذریعہ اس ناول میں اس طبقے کے اس کرب اور محرومی کی عکاسی کی فنکارانہ کوشش کی گئی ہے۔ یہ طبقہ مذہبی کتابوں کو پڑھنا تو درکنار ان کے بول بھی سن نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے ناول کی ابتدا ہی اس واقعے سے کی ہے جب جھگرو نام کے ایک دلت نے غیر ارادی طور پر دویہ بانی کے کچھ بول سن لیے۔ اس کے عوض میں اس کے کان میں شیشہ گھول کر ڈال دیا گیا جس کی منظر کشی اس ناول کے اقتباس میں دیکھئے۔

''ہون کنڈ کے چبوترے کے نیچے پتھریلی زمین پر جھگرو کسی بلی چڑھنے والے جانور کی مانند پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ آنکھوں کے ڈلے باہر نکل آئے تھے، چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ رگڑ سے جسم کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی اور اس سے خون رس رہا تھا، اس کی کربناک چیخ دور دور تک گونج رہی تھی۔''

(دویہ بانی صفحہ نمبر ۵)

جھگرو کو یہ سزا اس لیے ملی کہ اس نے مریادا کو بھنگ کیا تھا، اور ودھان کو توڑا تھا۔ یہ وہی ودھان ہے جو لوگوں نے اپنے مفاد کے لیے گڑھ لیے تھے۔

''دویہ بانی کیول ہمارے لیے ہے۔

جو ہم میں سے نہیں، اس کے لیے دویہ بانی نہیں۔

ورجت ہے دویہ بانی کا سننا اس کے لیے جو ہم سے الگ ہے۔

ہمارے اترکت جو کوئی دویہ بانی سنے گا، اس پر دیوتا کا شراپ چڑھے گا۔

دویہ بانی جن پر ورجت ہے یدی انھیں سننے دیا گیا تو دھرتی دیو پرکوپ سے بھر جائے گی۔

کوئی بھی نہیں بچ پائے گا

جو ہم میں سے نہیں یدی اس نے دویہ بانی سنی تو ڈنڈ کا بھاگی ہوگا۔

دویہ بانی کی رکشا کرنا ہمارا پرم کرتو یہ ہے۔

دویہ بانی کی شرکشا کے لیے یدی رکت بھی بہانا پڑے تو بہاؤ۔ گردن کاٹنی پڑے تو کاٹو، بڑے سے بڑا بلیدان دینا پڑے تو دو۔

اب آیئے دیکھیں کہ ودھان کو کس نے توڑا، اور مریادا کو کس نے بھنگ کیا۔

۱۔ غیر ارادی طور پر ہونے والے عمل کی سزا نہیں دی جاسکتی، کیونکہ انجانے طور پر گناہ ہونے کی کوئی سزا نہیں ہوتی۔

۲۔ ہندو قوم میں جیو کی ہتیا کو پاپ تصور کیا جاتا ہے، جانوروں کو بھی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی مذہب میں انسانوں کے ساتھ اس طرح کے فعل انجام کیسے دیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ ودھان تو بابا نے توڑے تھے، جس نے ایک نابالغ لڑکی بندیا کی عزت کو تار تار کیا تھا۔

۴۔ جس کا چھونا پاپ ہو اس کے ساتھ سمبھوگ کرنا پن کہاں سے ہو جائے گا۔

۵۔ کسی بھی قوم میں جھوٹ بولنا پاپ ہے لیکن بابا جھوٹ کا سہارا لیکر بالو کو بھی سزا کے طور پر اس کے بھی کان میں شیسہ ڈالوا دیتا ہے۔

۶۔ دویہ بانی کے بول اگر کوئی کسی نیچ ذات کو سناتا ہے تو اسے بھی ڈنڈ ملتا ہے، مگر بابا نے اپنی عیاری اور مکاری سے اپنے پوتے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جو قاری کے ذہن میں از خود پیدا ہوئے ہیں اور یہی اچھے فن پارے کی پہچان بھی ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوں کیونکہ یہیں سے بہتر امکانات کی تلاش اور تبدیلی کی خواہش جنم لیتی ہے اور ادب کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کا حرف آغاز ثابت ہو۔

آیئے اب ہم ورن ووستھا کے نظام کو بھی دیکھتے چلیں۔

ہندو مائتھالوجی کے مطابق برہما نے سر سے برہمن کو پیدا کیا، اور اس کے ذمے چنتن منن، شکشا دکشا، اور پوجا ارچنا کے کام کو سونپا۔ بازوؤں سے سورویروں کو پیدا کیا جس کے ذمے اپنے چھیتر کی سیماؤں کو دشمنوں سے بچانا تھا۔ اور پیٹ سے پیدا شخص کو زندگی کی جیوکا کو پورا کرنے کی ذمہ داری دی گئی، اور پیر سے پیدا شخص کے ذمے سماج کی سیوا ہاتھ آئی۔

برہما نے ورن ووستھا کو تقسیم کرنے کے بعد اس کے فوائد اور نقصانات کو بھی واضح کیا ہے۔

یدی تم چاروں اپنی اپنی پریدھی میں رہ کر کام کروگے تو شرشٹی کا سنتلن بنا رہے گا، انیتھا سنتولن بگڑ بھی سکتا ہے، سنتولن بگڑنے کا ارتھ ہے شرشٹی کا وناش۔ ارتھات تم سب کا وناش۔ اتہہ سنتولن بنائے رکھنا اتی آوشیک ہے اور اس کے لئے آوشیک ہے کہ تم اپنی اپنی پریدھی میں درھڑتا سے جمے رہو۔"

ہم اس قول کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ مریادہ کو کس نے بھنگ کیا ہے؟ بابا نے یا جھگرو اور بالو نے۔۔۔!

گندگی دلت معاشرے کا جزو لازمی ہے، جس کو پیٹ کے لالے پڑے ہیں، اسے اور کیا دکھے گا۔ بس صرف اور صرف بھوک۔ اسے اپنے گھر کی گندگی نہیں دکھتی، دوسروں کے گھروں میں بیگار کرتے ہوئے اتنا موقع کہاں ہاتھ آتا ہے کہ وہ اپنے گھر کو صاف کریں، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گندگی میں رہتے رہتے انھیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ ان کا گھر گندا بھی ہے۔ سماج کو ان دلتوں کی گندگیاں تو دکھی مگر ان کی محنت نہیں جنھوں نے اپنے گھر کو گندا رکھ کر اپنے سوامیوں کے گھروں کو چمکانے کی کوشش کی مگر اس کا صلہ یہی ملا کہ وہ زمانے کا عتاب جھیلتے رہے۔

"تنگ، تاریک، گندی، گھنونی، اور کیچڑ میں سنی تعفن بھری گلیاں.....راہ میں پڑے گوہ گوبر، چھیرا، مینگنی، لید، مل موت اس کی ناک پر وار کرنے لگے۔ کیچڑ اور بدبودار پانی سے لبالب بھری نالیوں میں کلبلاتے ہوئے کیڑے اور کناروں پر رینگتے ہوئے دم دار پلو اس کی آنکھوں کے راستے سے دماغ میں گھسنے لگے۔ بالک کا جی متلانے لگا۔ طبیعت مالش کرنے لگی۔" (صفحہ ۱۵)

ایک اور اقتباس دیکھتے چلیں۔

مٹی کی بونی دیواروں پر پھوس کو چھدرا ہوا چھپر تنگا تھا جس سے کالے کالے جالے لٹک رہے تھے۔ دیواریں کھڑکی اور روشن دان سے کھالی تھیں، ایک طرف کی دیوار میں کچھ کھونٹیاں گڑی تھیں جن پر میلے کچیلے کپڑے ٹنگے تھے۔.....بڑے طاق میں کچھ چھوٹے بڑے دبے پچکے بدرنگ برتن تلے اوپر پڑے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ رینٹ چپکی ہوئی تھی، جس پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ ایک تازہ جگہ بلغم کے زرد لیس دار لاسے نے مکھیوں کے ایک جھنڈ کو پھنسا رکھا تھا۔ (صفحہ ۱۶)

ان دو اقتباسات کے ذریعہ ہم ان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں، جس کی وجہ صرف اور صرف علم کی کمی ہے جس پر برہمن طبقہ نے پابندی عائد کر رکھی ہے اس کے پیچھے وہی عوامل کارفرما ہیں کہ اگر یہ قوم تعلیم یافتہ ہوگئی تو ہم بیگار کس سے لیں گے اور ہمارے کام کون انجام دے گا۔

ناول نگار نے اس ناول میں اس فرق کو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے جو ایک تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں پایا جاتا ہے۔ اس ناول کا ایک اہم کردار بالو جسے خاموشی کے ساتھ بالک دویہ بانی کے بول سناتا ہے تاکہ وہ بھی تعلیم یافتہ ہو سکے، اس کا بالو پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اس میں اچھے اور برے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ بالو کے گھر والے کسی بھوت پریت کا سایہ تصور کرتے

ہیں مگر بابا جس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور جس کے پاس شعور و بصیرت ہے وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں اس نے دویہ بانی کے بول سنے ضرور ہیں۔ بقول بابا

''آشچر یہ ہے کہ تم نے اسے نہیں سنائی تو پھر کس نے سنائی ہوگی؟

بابا آپ کو کیسے پتہ چلا کہ بالو نے دویہ بانی سنی ہے۔

اس کے ہاو بھاو سے۔

کیا ہوا اس کے ہاو بھاو کو؟

سامانیہ نہیں دکھتا۔

بابا اس میں ایسا کیا اسامانیہ دکھائی دیا جو پہلے نہیں تھا؟

بہت کچھ

مجھے بھی تو بتایئے۔

اس کے رنگ وروپ، چال ڈھال، بول چال، رہن سہن، سب میں بدلاؤ آ گیا ہے۔

اس طرح ناول نگار نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ صرف اور صرف تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ لوگوں میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔ بالیشور جو برہمن ہے اور بابا کا پوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ سبھی علم حاصل کریں تاکہ ان میں جو احساس کمتری ہے وہ ختم ہو سکے۔ بالیشور سماج کی ایک ایک شئے کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے سوالوں کے جواب چاہتا ہے مگر بابا اور اسکی ماں اسکی دلیلوں کا مناسب جواب نہیں دیتے۔ اس کا اپنے بابا سے یہ کہنا کہ

''بابا دویہ بانی تو سننے کے لیے ہے، پھر اس کا سننا اپرادھ کیوں؟ اور یدی اپرادھ ہے تو اسے ہم اور آپ بھی سنتے ہیں، ہمارے کان میں تو کبھی سیسہ نہیں ڈالا گیا؟ مورکھ! بھلا ہمارے کان میں سیسہ کیوں ڈالا جائے گا، دویہ بانی تو ہے ہی ہمارے کان کے لیے''

جس کا نتیجہ یہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ وہ بالو کو خاموشی سے دویہ بانی کے بول سنانے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ ایک گناہ کر رہا ہے، وہ اپنے بابا کے اصولوں کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ اس لیے بھی کہ اس کے بابا جو کر رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کی عقل ان کی اس دلیل سے مطمئن نہیں ہو پاتی۔ وہ اس نظام کی مخالفت کرتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بالو کے باپ جھگرو کے کانوں میں اسی بول کے سننے کے سیسہ ڈال دیا گیا تھا۔

بابا کا دلتوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں بالک کو سمجھ میں نہیں آتا اور وہ فوراً یہ سوال کرتا ہے

یہ ہم میں سے کیوں نہیں ہے

اس لئے کہ یہ ہم سے الگ ہے

بابا یہ ہم سے الگ کیوں ہے

اس پر کار کہ..... بابا چپ ہو گئے، کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔

بیٹے تم ابھی چھوٹے ہو، یہ باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ ابھی تمہاری آیو کھیلنے کی ہے۔

بابا کا بالک کو چھوٹا کہہ کر چپ کرا دینا بے پناہ معنویت کا حامل ہے۔ اگر آپ غور کریں تو واضح ہوگا کہ بابا اس غیر منصفانہ طبقاتی نظام کا استعارہ ہے جو بالو جیسے لوگوں کے بشری احترام کو تسلیم ہی نہیں کرتا اس کے ساتھ ہی بالک اس تبدیلی کی علامت ہے جو اسی طبقاتی نظام کو چیلنج کر رہی ہے۔ دراصل کوئی بھی ادب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے اشاروں سے قاری کے ذہن کو سوچنے پر آمادہ کرتا ہے تاکہ صورت حال کو بدلا جا سکے۔ بالیشور کو یہ جواب مطمئن نہیں کرتا کہ بالو اس سے الگ ہے۔ وہ دونوں کے اعضائے جسم کا تقابل کرتا ہے تو پاتا ہے کہ دونوں ہاتھ بھی رکھتے ہیں، اور پیر بھی، آنکھیں بھی اور چہرہ بھی، ناک بھی اور کان بھی

۔اگر یہ سب کچھ دونوں میں یکساں ہے تو پھر ان کی سماجی حیثیت میں یہ فرق کیوں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

سیدھا جسم
دو پاؤں
پاؤں کے اوپر پیڑو
پیڑو کے اوپر پیٹ
پیٹ کے اوپر چھاتی
چھاتی کے اوپر کندھے
کندھے سے جڑے دو ہاتھ
دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ انگلیاں
کندھوں کے بیچ گردن
گردن کے اوپر چہرہ
چہرے میں ایک منھ
ایک ناک
دو آنکھیں
دو کان
ایک پیشانی
پیشانی کے اوپر سر
سر میں بال
سب کچھ تو ہمارے جیسا ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ اس تقابل نے یہ ذہن نشین کرا دیا کہ سبھی برابر ہیں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا، ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا قرار دیں۔اس سے ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ سبھی کو سبھی حقوق ملنے چاہئے چاہے وہ تعلیم سے متعلق ہوں یا کسی اور سے متعلق۔ناول کے اختتام پر ناول نگار نے اس بت کو گرا دیا ہے جو صدیوں سے اپنی پرستش کروا رہا تھا۔

غضنفر نے کہانی کی بنت میں دویہ بانی کو مرکزی حیثیت عطا کی ہے۔وہ چند اہم واقعات کے حوالے سے سماجی تفریق اور طبقاتی تقسیم کے ہولناک نتائج سے قاری کو واقف کراتے ہیں۔کبھی کبھی یہ ضرور لگتا ہے کہ ناول جلد بازی میں لکھا گیا ہے، کئی ایسے واقعات جو زیادہ توجہ و توسیع کے متقاضی ہیں لیکن ناول نگار ان سے سرسری گزر جاتا ہے۔ایک اور اہم بات یہ نظر آتا ہے کہ ناول عمل سے زیادہ مکالموں کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔گندگی بے حسی کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے اور ہم اسے جہالت کا لازمہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔دویہ بانی اس جہالت و بے حسی کا علاج ہے مگر اسے سنا نہیں جا سکتا۔جن کانوں نے اسے سن لیا ان کے گھروں کی گندگی یعنی جہالت اور بے عملی از خود ختم ہو جاتی ہے۔ناول نگار بندیا کی آبروریزی کے واقعے کو پورے طور پر کہانی کا حصہ نہیں بنا پایا۔خود بندیا پر اس حادثے کا اثر نظر نہیں آتا۔بالیشور کا اس سے شادی پر اس انکشاف کے بعد بھی آمادہ رہنا کہ خود اس کا بابا بندیا کی عزت سے کھیل چکا ہے، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نئی نسل اب سمجھوتے پر آمادہ نہیں۔امرت منتھن کی روایت کو دیوتاؤں اور اسروں کی جگہ اعلیٰ ذات و ادنیٰ ذات کے تناظر میں بے حد اہم قرار دیا جانا چاہیے۔ناول نگار بتانا چاہ رہا ہے کہ امرت اب بھی اعلیٰ ذات والوں کے قبضے میں ہے۔اس طرح دلت مسائل پر یہ ناول اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناول کے بالکل آخر میں یہ چنگاریاں شعلہ بن جاتی ہیں اور اچھوتوں و دلتوں کے بچوں کو بھی بالیشور پاٹھ شالا میں جانے اور پڑھنے کا حکم دے دیتا ہے۔اس طرح یہ ناول سماجی تبدیلی کے آغاز سے قاری کو واقف کراتا ہے اور ساتھ ہی ایک نئے تخلیقی مزاج کی جانب اشارہ کرتا ہے جو روایت شکنی کو سماجی حقوق کی دستیابی کا حرف آغاز تسلیم کرتا ہے۔

سلیمان زارع (ایرانی): اردو پی ایچ۔ڈی اسکالر مانو یونیورسٹی۔شعبہ اردو

حافظ شیرازی اور غالب دہلوی کا مختصر تقابلی مطالعہ

جب آٹھویں صدی ہجری قمری کے عظیم شاعر یعنی فارسی زبان کے بادشاہ غزل خواجہ شمس الدّین محمد حافظ شیرازی اور میرزا اسداللہ خان غالب دہلوی کی سوانح عمری اور شاعری پر نظر دوڑائی جائے تو ان میں بہت مشابہتیں نظر آتی ہیں۔ اس مقالے میں ان مشابہت اور مماثلت کا مختصر طور پر جائزہ لینے کوشش کی گئی ہے۔ترجمان البلاغت لسان الغیب خواجہ شمس الدّین محمّد حافظ شیرازی سنہ 720ھ مطابق 1320ء شیراز میں پیدا ہوئے۔آپ کے دادا اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے۔اتابکان فارس کے وقتوں میں شیراز میں آئے۔اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔بچپن ہی میں خواجہ صاحب کے والد خواجہ بہاءالدّین انتقال کر گئے۔اس لئے تھوڑے عرصے میں ہی باپ کی کمائی اڑ گئی۔گھر میں فاقے ہونے لگے۔خواجہ صاحب سن شعور کو پہنچے تو خمیر بنانے کا پیشہ (خبازی) اختیار کیا۔آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے۔گھر کے پاس ہی ایک مکتب تھا،جس میں محلے کے سب لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے۔خواجہ صاحب جب اس منظر کو دیکھتے تو ان کے دل میں بھی تعلیم کا شوق پیدا ہوتا۔رفتہ رفتہ یہ شوق اس قدر پروان کہ مکتب میں داخل ہو گئے۔خمیری سے کچھ حاصل ہوتا تو اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک تہائی معلّم کو دیتے۔بقیہ خیرات کر دیتے،انہوں نے مکتب میں قران مجید حفظ کیا۔یہی مناسبت آپ کے تخلص کا موجب بنی۔اس زمانے میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔خواجہ صاحب نے بھی طبع آزمائی کی۔شروع میں چونکہ طبیعت موزوں نہ تھی آپ کے بے تکے اشعار اور لغو گوئی کا جگہ جگہ مذاق اڑایا جاتا تھا۔دو سال تک یہی حالت رہی۔ایک دن حد سے زیادہ رنجیدہ ہوئے تو بابا کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں: ”جاؤ اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔صبح کو اٹھے تو اپنی شہرہ آفاق غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
واندر ان ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

(غزل191)

یعنی: گذشتہ رات صبح کے وقت انہوں نے مجھے غم سے نجات دیدی/ اور اس تاریکی میں انہوں نے مجھے آب حیات دے دیا۔کیا بابرکت صبح تھی اور کیا مبارک رات تھی وہ قدر کی رات جس نے مجھے تازہ دستاویز دے دی۔

غالب اور حافظ کے سیاسی و سماجی دور بھی یکسانیت کے حامل ہیں۔دونوں شعراء اپنے دور کے چار دورِ حکومت کے شاعر تھے۔حافظ نے مغل کے چار سلاطین کے عہدِ حکومت کی تبدیلیاں دیکھیں یعنی ابو اسحاق۔مبارز الدین محمود۔شاہ شجاع اور شاہ منصور جو شاہ شجاع کا بھتیجا تھا۔ان چار سلاطین آل اینجو، مظفریان اور تیموریان کے عہد کے بادشاہ تھے۔غالب نے بھی

چار دور حکومت یعنی مغل بادشاہوں سے شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ اور ابوظفر بہادر شاہ کا دور اور انگریزوں کی آمد کے دور کو دیکھا تھا۔

حافظ اور غالب کے اشعار میں قرآن پاک کی تاثیر:

مثال کے طور پر حافظ کا کہنا ہے:

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

(دیوان حافظ، غزل 189)

یعنی: آسمان امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا/ مجھے دیوانے کے نام، انہوں نے فال کا قرعہ نکال دیا۔

اسی بات کو غالب بھی اسی طرح بیان کرتے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برق تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

خواجہ میر درد بھی اپنے شعر میں فرماتے ہیں:

ارض و سماء کہاں تیری وسعت کو پا سکے
یہ میرا ہی دل ہے جہاں تو سماء سکے

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے:

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ وَ إِنْ تُؤْمِنُوا وَ تَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَ لا يَسْئَلْكُمْ أَمْوالكم

(سورہ محمد (ص) آیت 36)۔

یعنی: بس دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے، اور اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہیں تمہارے (اعمال پر کامل) ثواب عطا فرمائے گا اور تم سے تمہارے مال طلب نہیں کرے گا۔

اس بارے میں حافظ شیرازی کا شعر ہے:

دراین مقام مجازی بہ جز پیالہ مگیر دراین سراچہ بازیچہ غیر عشق مباز

(غزل 259)

یعنی: اس مجازی مقام میں (دنیا) پیالے کے سوا نہ تھام اور اس کھیل کود کی سرائے میں عشق کے علاوہ کوئی کھیل نہ کھیل۔

غالب بھی اسی بات کو اپنے شعر میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

(غزل 229، نوائے سروش)

ریاکار اور دھوکا باز واعظ کے بارے میں حافظ شیرازی اور غالب دہلوی کا خیال ایک جیسا ہے۔ اس بارے میں حافظ کا کہنا ہے:

واعظ ان کاین جلوہ در محراب و منبر می کنند
چون بہ خلوت می روند آن کار دیگر می کنند

(دیوان حافظ، غزل 199، سطر 1، ص 142)

یعنی: یہ واعظ حضرات جو کہ محراب اور منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں تو وہاں کچھ اور ہی کام کرتے ہیں۔

یہی مطلب غالب کے بیان میں بھی نظر آتا ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(غالب، غزل 23، بیت 9)

یعنی واعظ کو میخانے اور شراب نوشی سے کیا تعلق۔ ہاں اتنی بات ہمیں معلوم ہے کہ کل وہ دہر جاتا تھا اور ہم وہاں سے نکلے تھے۔

گویا میدان خالی دیکھ کر چوری چھپے پینے کی عادت ہوگی۔ شعر رندانہ ہے مگر اسلوب بیان بہت دلکش اور نادر ہے۔

حافظ اور غالب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ

ان کے فرزند عزیز جوانی میں انتقال کر گئے اور اپنے باپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل سے اپنے گھر اور اہل خانہ کی محبت کم نہ ہوئی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:

دلا دیدی کہ آن فرزانہ فرزند
چہ دید اندر خم این طاق رنگین
بجای لوح سیمین در کنارش
فلک بر سر نہادش لوح سنگین

(رباعی)

معنی: کیا اے دل تو نے دیکھا کہ یہ عقلمند بیٹا عالم ہستی میں اس نے کیا محسوس کیا کہ؟ اپنے ساتھ چاندی تختی (معشوق) کے بجائے فلک نے اس کے سر پر لوح مزار رکھا۔

مرزا صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا، اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بیوی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر سے چند سال پہلے ان کی بیوی کے بھانجے زین العابدین خان عارف کا انتقال ہو گیا، اور ان کے دونوں بچے ایک باقر علی خان اور دوسرے حسین علی خان صغیر سن رہ گئے۔ تو مرزا اور ان کی بیوی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خان کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔ غالب مرثیہ عارف کے ایک حصے میں کہتے ہیں:

ہاں اے فلک پیر! جوان تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

غالب کے برخلاف حافظ نے لمبے لمبے سفر نہیں کیے۔ دکن کے بہمنی سلاطین کے پانچویں حکمران محمود شاہ بن حسن (769-780ھ) نے جو علم دوست اور ادب پرور تھا، حافظ کو اپنے ملک میں بلانا چاہا، محمود شاہ نے اس کو دعوت دیتے ہوئے زادراہ بھی روانہ کیا، حافظ دکن کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی طوفان میں پھنس گئی، لیکن کشتی بندر ہرمز واپس آئی، یعنی صرف ایک مختصر سا سفر جو انھوں نے بندر ہرمز تک اور ایک سفر یزد تک کیا تھا اور باقی عمر وہ شیراز ہی میں مقیم رہے۔ میر فضل اللہ کو، جس کے توسط سے شاہ محمود نے انہیں زاد راہ بھیج کر بلایا تھا۔ یہ غزل لکھ کر بھیج دی:

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد
بہ می بفروش دلقِ ما کزین بہتر نمی ارزد
بہ کوی می فروشانش بہ جامی بر نمی گیرند
زہی سجادہ ی تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
شکوہِ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است
کلاہِ دلکش ست اما بدردِ سر نمی ارزد
رقیبم سر زنشہا کرد کز این باد سربر تاب
چہ افتاد این سر ما را کہ خاکِ در نمی ارزد

(غزل 13)

یعنی: تھوڑی دیر بھی غم میں بسر کرنا، تمام دنیا کے بدلے میں تاب نہیں۔ جاری گدڑی شراب کے عوض بیچ دو اس سے بہتر قیمت کے لائق نہیں ہے۔

مے فروشوں کے کوچے میں اس کو ایک جام میں بھی نہیں لیتے ہیں۔ سبحان اللہ، تقوی کہ کیا مصلّے ہے کہ ایک ساغر کے بھی لائق نہیں۔

شاہی تاج کا دبدبہ جس میں جان کا خوف بھی ہے۔ دلکش ٹوپی ہے، لیکن درد سر کے لائق نہیں۔

رقیب نے مجھے جھڑکیاں دیں، کہ اس باب سے سرشار ہے۔ اس ہمارے سر کو کیا ہوا دروازہ کی خاک کے لائق نہیں۔

آخر میں یہ بات قابل ذکر ہے دونوں شعراء کا واقعہ وفات بھی ایک جیسا ہے۔

یہ روایت مشہور ہے کہ حافظ کے انتقال کے بعد بعض فقہا نے کہا کہ ان کے اعلانیہ فسق کی وجہ سے ان کی نماز جنازہ جائز نہیں۔ شیراز شہر کے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا کہ اسے مسلمانوں کے طریقے سے دفنانا چاہیے یا غیر مسلمانوں کے روش اور طریقے سے۔ شاہ منصور والی شیراز بھی جنازے کے ساتھ تھا۔ اس نے شہر کے فقیہوں سے کہا کہ اس کی بے دینی ثابت کرو۔ انھوں نے کہا اس کا دیوان اٹھا کر کہیں سے ورق الٹ لیجیے، جب دیوان کھولا گیا تو صفحے پر سب سے پہلا یہ شعر تھا:

قدم دریغ مدار از جنازہ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہ است، می رود بہ بہشت

(غزل 39)

یعنی: حافظ کے جنازے کے پیچھے قدم اٹھاؤ اور آؤ اگر چہ حافظ ایک گنہ گار آدمی ہے، لیکن اس کے باوجود جنت میں جائے گا۔

اسی طرح جب غالب نے وفات پائی، تو لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا، بعض لوگوں نے کہا غالب شیعہ تھا۔ اس لیے شیعوں کے مطابق تکفین اور تدفین کرنا ہے اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ اہل سنت کے طریقے کے مطابق تکفین اور تدفین کرنا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاؤ سنی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے ان کی حق گزاری میں شریک ہوتے۔

کتابیات:

6-83-30161-ذبیح اللہ صفا، فارسی ادب کے ارتقاء کی مختصر تاریخ، انتشارات امیر کبیر، تہران، 2000ء ص 31

2-حالی خواجہ الطاف حسین، یادگار غالب، ناشر ثمر آفسٹ پریس، دہلی 1986ء، ص-16-112-148-162-192

3-افشار، ایرج، دیوان کہنہ حافظ، انتشارات امیر کبیر، تہران، 1366ھ ش

4-عرشی، امتیاز علی خان، دیوان غالب اردو، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور، 1992ء

5- 5- 4-نعمانی، علامہ شبلی، شعر العجم، حصہ دوم، ناشر دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، 2011ء ص 371-

افتخار راغب۔ دوحہ قطر

غزل

تمہاری مہربانی کم نہیں ہے
مری آنکھوں میں پانی کم نہیں ہے
نہاں زخموں کا رونا کون روئے
عیاں ہے جو نشانی کم نہیں ہے
نہیں ممکن شمارِ زخمِ جذبات
تری ضد کی کہانی کم نہیں ہے
محبت میں ہوئے ہیں رائگاں ہم
ہماری رائگانی کم نہیں ہے
اجڑ جائے گا شاید بادہ خانہ
خمارِ لن ترانی کم نہیں ہے
جہاں چاہے دکھا دے رقصِ آتش
تری شعلہ بیانی کم نہیں ہے
میں اب بھی عقل کی زد میں نہیں ہوں
سو اب بھی خوش گمانی کم نہیں ہے
رواں تیری محبت ہے رگوں میں
غزل میں بھی روانی کم نہیں ہے
محبت کی فراوانی ہے راغبؔ
وفا کی ہی گرانی کم نہیں ہے

صالحہ صدیقی (ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

خواتین قلمکاروں کی کہانی (خودنوشتوں کا مطالعہ)

مرد قلمکاروں کی طرح عورتوں نے بھی دیگر صنف سخن کی طرح خودنوشتیں لکھی ہیں، جو صرف ان کی آتم کتھا ہی نہیں بلکہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ان خودنوشتوں میں اس عہد کی سیاسی ،سماجی ،معاشی ،معاشرتی ،تہذیبی ،ثقافتی اور روز مرہ کی زندگی کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ان خواتین قلمکاروں کی ایک طویل فہرست ہمیں ابتداً ہی سے نظر آتی ہیں۔اگر ابتدائی دور کی بات کی جائے تو سابق ریاست بھوپال کی حکمراں نواب سلطان جہاں بیگم حیاؔ (۱۸۵۸ء تا ۱۸۳۰ء) کے خودنوشت حالات زندگی مانی جاتی ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کے حالات چار جلدوں میں تحریر کئے ہیں۔(۱) تزک سلطانی۔ اس میں ان کی پیدائش ۱۸۵۸ء سے مسند نشینی ۱۹۰۱ء تک حالات وکوائف درج ہیں۔(۲) گوہر اقبال (۱۹۱۳ء) میں مسند نشینی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء سالہ دور حکومت کے حالات ہیں۔ اختر اقبال (۱۹۱۴ء) میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۴ء تک کے حالات ہیں اور (۴) ضیاء اقبال (جو شائع نہ ہوسکی) اس میں ۱۹۱۴ء کے بعد کے حالات ہیں۔اس کے بعد خواتین کی آپ بتیاں بیسویں صدی میں نظر آئیں، صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۹ء) نذر سجاد حیدر (۱۸۹۴ء تا ۱۹۶۷ء) اور حجاب امتیاز علی (۱۹۰۳ء) نے اپنے کچھ حالات زندگی تحریر کئے جو رسائل میں شائع ہوئے۔ان کی کوئی مستقل خودنوشت شائع نہیں ہوئی۔اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں پنجاب کی ایک خاتون وزیر سلطان کی خودنوشت، نیر گئی بخت (ناشر ذکاء اللہ حسین جالندھر) منظر عام پر آئی۔ یہ کوئی مشہور ادبی شخصیت نہیں ہوئی یہ ہندوستان کی دیگر عورتوں کی طرح ایک عام گھریلو خاتون تھی جن کی زندگی نہایت مصائب و پریشانیوں میں گزری ان کا تعلق کابل کے شاہی خاندان سے تھا۔ان کی شادی ایک نوجوان سے ہوئی لیکن وہ خوشگوار ثابت نہ ہوسکی۔سسرال اور خاوند کے ظلم وستم کے باعث ان کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ان کی یہ کہانی بڑی دلدوز ہے، اسی سال ۱۹۴۲ء میں پنجاب کی ایک مشہور ایکٹریس بملا کماری جس کا نام پریما تھا ان کی خود نوشت ایک ایکٹریس کی آپ بیتی کے نام سے نرائن دت سہگل لاہور نے شائع کیا۔اس طرح آزادی تک اور کچھ خواتین نے بھی اپنی مختصر آپ بیتیاں لکھی ہوں گی جو مشہور نہ ہوسکیں۔اردو میں خواتین کی آپ بیتی نگاری پر آزادی برصغیر ۱۹۴۷ء کے بعد بہار آئی اور ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۰ء (اور اکیسویں صدی کے اوائل میں بھی) کئی خواتین نے اپنی مختصر یا طویل آپ بیتیاں تحریر کیں، شائع کیں، کئی غیر زبانوں کی خواتین کی خود نوشتوں کے تراجم بھی ہوئے۔ان میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والی خواتین کی آپ بیتیاں کافی اہم ہیں۔آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو میں متعدد مرد و خواتین کی چھوٹی بڑی آپ بیتیاں شائع ہوئی ہیں۔جن میں عہد حاضر کی مشہور اردو شاعرہ عزیز جہاں بدایونی، المتخلص بہ ادا کی نوشت انفرادی وامتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ادا جعفری کا نام عزیز جہاں تھا۔شادی سے قبل ادا بدایونی کے نام سے مشہور تھی۔نورالحسن جعفری صاحب سے شادی کے بعد ادا جعفری نام اختیار کرلیا۔وہ ۱۹۲۴ء میں اترپردیش کے مردم خیز شہر بدایوں میں ایک مغرز گھرانے میں پیدا ہوئی۔ابتدائی وثانوی تعلیم کے بعد ۱۹۴۰ء میں انٹرنس پاس کیا۔شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۳۶ء میں پہلے اختر شیرانی سے مشورہ سخن کیا پھر نواب جعفر علی خاں اثرؔ سے اصلاح سخن لی، وہ غزل نظم دونوں پر قدرت رکھتی ہیں کلام جرائد میں بکثرت شائع ہوئے۔کلام کے مجموعے میں ساز ڈھونڈتی رہی۔شہر درد، غزالاں تم تو واقف ہو۔ساز سخن بہانہ، اور انتخاب کلام ساز سخن شائع ہوئے۔اپنی خودنوشت میں ادا جعفری نے اپنی توجہ کا مرکز صرف اپنی ذات کو ہی نہیں بلکہ عہد و ماحول کو بھی بنایا ہے۔اسمیں دو تصویریں ہیں۔پہلی بدایوں کی الجھے بال والی کمسن لڑکی جس کی دنیا اس پھاٹک کے اندر تھی جسے ٹونک والوں کا پھاٹک کہا جاتا تھا۔ جہاں زنجیر تک کو دستک کی اجازت نہ تھی۔اس کے آنچل میں تنہائی اور اداسی

تھی۔ زندگی کی مسرتیں نہ تھیں۔ دوسرے تصویر جس میں اسے زندگی کی مسرتیں ملیں جسے اس نے دوسرے جنم کا نام دیا ہے۔

آدا نے اپنے حالات زندگی ایک ڈائری میں محفوظ کر لئے تھے جو ۱۹۴۷ء کے خونریز فسادات اور تباہی و بربادی میں برباد ہوگئے۔ لیکن آدا جعفری نے اپنے وقت کے تمام حالات کوائف حادثات واقعات شخصیات سے حاصل کردہ تاثرات کو مخصوص دلکش انداز میں محفوظ کرلیا۔

اردو خودنوشت نگاروں میں ایک اور اہم نام بیگم انیس قدوائی کا ہے جن کی خودنوشت ''آزادی کی چھاؤں میں'' قومی ایکتا ٹرسٹ نئی دہلی نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ وہ اردو کے مشہور و معروف مزاح نگار ولایت علی بمبوق کی بیٹی تھی۔ ان کی شادی شفیع احمد قدوائی سے ہوئی۔ وہ ان کے ساتھ دہلی آکر رہیں۔ آزادی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران۔ ان کے شوہر شفیع احمد قدوائی قیام امن کی کوششوں کے دوران، مسوری میں شرپسندوں کے ہاتھوں شہید کر دئے گئے تھے۔ فسادات کے دوران انیس قدوائی نے حالات کی خرابی دور کرنے۔ فسادزدگان کی امداد کرنے، پناہ گزینوں کے کیمپ لگانے، ان کی مدد کرنے انہیں بچانے، ان کی حفاظت اور ان کی بازآبادکاری کے لئے عملی طور پر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ان روح فرسا حالات اور انسانوں کی تباہی و بربادی کو اپنی نظروں سے دیکھا۔ ان کے اثرات محسوس کئے اور اپنے تاثرات کو ایک کتاب کی شکل میں قلمبند کیا۔ یہ ان کی یادنگاری (MEMOIRS) کی طرز کی خودنوشت ہے۔ اس میں ۱۹۴۷ء ملک کے اردگرد کے حالات و کوائف، ذاتی تجربات و مشاہدات بڑے دلدوز و انصاف پسندانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ نہایت غیر جانبداری و معروضی انداز میں انہیں پیش کیا گیا ہے۔

آدارِ فانی سے کوچ کر گئیں پر آپ بیتی مکمل نہ ہوسکی۔ اس کا مسودہ ان کی بیٹی کشور کے پاس تھا اے انور صدیقی کی پیش گفتار کے ساتھ ۱۹۸۳ء میں شائع کیا گیا۔

اسی طرح بانو سرتاج نے اپنی باقاعدہ مکمل و مفصل سرگزشت ابھی تو قلمبند نہیں کی، لیکن انہوں نے اپنے حالات مختصراً کسی کسی جگہ ضرور تحریر فرمائے ہیں جیسے رسالہ پاکیزہ آنچل کے ایک شمارے میں یا رسالہ شاعر کے شمارہ نومبر ۲۰۰۶ء میں یا ڈاکٹر محمد سعداللہ صاحب کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (جلگاؤں بلڈانہ) کے تحقیقی کاموں کے سلسلے میں وغیرہ۔ ان کے ذریعے ان کے حالات و کوائف معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تحریریں ان کی آپ بیتی نگاری کا نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ اس سے ان کی زندگی کے حالات و کوائف، سروس اور ادبی سرگرمیوں پر روشن پڑتی ہے لیکن عہد و ماحول، سماج و معاشرت کے سماجی سیاسی معاشرتی حالات و شخصیات وغیرہ پر روشنی نہیں پڑتی۔

اردو کے مشہور ادیب اختر حسین رائے پوری (۱۲، جون ۱۹۱۲ء ہم سفر ۱۰، اپریل ۱۹۹۲ء) کی اہلیہ بیگم حمیدہ اختر کوئی ادبی شخصیت نہیں رہیں لیکن انہوں نے اپنی خودنوشت ''ہم سفر'' کے عنوان سے لکھ کر اپنی ایک ادبی یادگار ضرور چھوڑی ہے۔ اسے اردو آپ بیتیانہ ادب اور خواتین کی آپ بیتی نگاری میں ایک قابلِ قدر اضافہ قرار دیا گیا ہے۔

اختر حسین رائے پوری نے ۱۹۳۵ء میں مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے اور ۱۹۴۰ء میں پیرس یونیورسٹی سے ہند قدیم کی تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۷ء میں انجمن ترقی اردو میں معاون رہے پھر آل انڈیا ریڈیو میں رہے اور آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ یونیسکو میں بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۲ء میں انتقال کیا۔

بیگم حمیدہ اختر بھی ان کے ہمراہ رہیں۔ ہندوستان میں پاکستان میں بھی ان کی یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہاں عموماً دستیاب نہیں۔ بیگم حمیدہ اختر کی یہ خودنوشت (Memoris) کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اسے انہوں نے یادوں کے سہارے ترتیب دیا ہے۔ بڑی سادگی سچائی ایمانداری کے ساتھ عام بول چال کی سادہ شیریں زبان میں اپنی زندگی کی تلخ و شیریں یادوں کو سمویا ہے۔ اختر حسین اپنے عہد کے ممتاز و معروف ادیب نقاد، صحافی و مترجم تھے۔ ان کے تعلقات اپنے عہد کے ممتاز ادبا و شعراء، صحافیوں و افسران حکومت و سیاسی رہنماؤں سے رہے۔

ان کے ادب پر جدید تصورات و رجحانات کا گہرا اثر تھا۔ آپ بیتی میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، گووند ولبھ پنت، جیسی سیاسی شخصیتوں کے ساتھ مولوی عبدالحق، قاضی

عبدالغفار اور کئی مقتدر ادبی شخصیات کے تعلقات و تاثرات کا بے تصنع انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

جیلانی بانو کا شمار عہد حاضر کی مشہور و معتبر خواتین ادباء، افسانہ و ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ مشہور شاعر علامہ سید حسن حیرت بدایونی (۱۸۹۶ء - ۱۹۷۵ء) کی صاحب زادی اور ڈاکٹر انور معظم (سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی) کی اہلیہ ہیں۔ ۱۴، جولائی ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے اردو میں ایم اے کیا۔ حیدرآباد میں مقیم ہوئیں۔ ۱۹۵۳ء سے افسانے لکھ رہی ہیں۔

ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے ناول ایوان غزل، نغمے کا سفر، وغیرہ مشہور ہوئے۔ انہیں کئی اعزازات و انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔

جیلانی بانو نے اپنی مختصر آپ بیتی تحریر کی ہے۔ جو رسالہ فن و شخصیت کے آپ بیتی نمبر میں بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ آپ بیتی کم اور یادوں کا مرقع زیادہ ہے۔ اس میں ان کی کچھ بچپن کی یادیں ہیں کچھ جوانی کی۔ کچھ ذات سے متعلق ہیں کچھ عہد و ماحول و معاشرات سے تعلق رکھتی ہیں۔ دو ھیال ننھیال دونوں کا تعلق اتر پردیش سے ہے۔ والد بسلسلہ ملازمت حیدرآباد آگئے تھے۔ وہ وہیں پیدا ہوئیں ہیں۔ لیکن حیدرآبادیوں کے نزدیک ملکی نہیں۔ اس رویہ کا انہیں بڑا احساس ہے۔ بچپن کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ سات بھائی بہن تھے۔ ان کا بچپن و لڑکپن سہیلیوں، گھر کے لوگوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے گزرا، اسکیچ بنانا، پینٹنگ، مشاعرے، ناٹک ان کے مشاغل تھے۔ مصوری ڈراما ان کے شوق ہیں۔ اگرچہ ان کے والد شاعر تھے مگر وہ شاعری کی طرف متوجہ نہ ہوسکیں، افسانوی ادب، افسانہ و ناول نگاری کو پسند کیا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں انہوں نے دنیا کے عظیم افسانہ نویسوں گورکی، موپاساں، چیخوف، عصمت، کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین وغیرہ کے افسانے پڑھ ڈالے تھے۔ اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ کہانی نویسی ان کی فطرت کے عین مطابق نکلی۔ جیلانی بانو کی یہ آپ بیتی مکمل نہیں۔ اگر وہ اسے مکمل کرلیں تو بلاشبہ یہ اردو آپ بیتیانہ ادب کے سرمایے میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد اردو میں ایک کے بعد ایک کئی اچھی آپ بیتیاں لکھی اور شائع کی گئی ہیں۔ ان میں کچھ خواتین کی آپ بیتیاں بھی ہیں۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ایک معرکتہ الآرا آپ بیتی حمیدہ سالم کی شورش دوراں ہے۔ جو اردو ادب، اردو نسائی ادب اور اردو آپ بیتیانہ ادب کا ایک گوہر بے بہا سمجھی گئی ہے۔

اردو کی معروف فکشن نگار (افسانہ و ناول نویسی) خاتون خدیجہ مستور لکھنو میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۸۲ء میں لندن میں انتقال کرگئی۔ آزادی سے قبل افسانہ نویسی میں شہرت حاصل کی، آزادی کے بعد پاکستان جاکر لاہور میں مقیم ہوگئی۔ ان کی بہن ہاجرہ مسرور (۱۹۲۹ء - ۲۰۱۰ء) بھی مشہور افسانہ نویس گذری ہیں۔ خدیجہ کے کئی افسانوی مجموعے اور دو ناول آنگن اور زمین شائع ہوچکے ہیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت تحریر کرکے پاکستان میں شائع کروائی ہے۔ لیکن اس کی رسائی ممکن نہ ہوسکی۔ انہوں نے مدیر نقوش محمد طفیل کی فرمائش پر نقوش کے آپ بیتی نمبر کے لئے جو مختصر آپ بیتی لکھی تھی۔ وہی ان کی خودنوشت کا نمونہ ہے۔ (اسے بعد میں فن و شخصیت آپ بیتی نمبر میں شامل کیا گیا۔)

خدیجہ مستور نے اپنے بچپن کے حالات میں کھیل کود، آٹھ سال کی عمر میں قرآن ختم کرلینے کا ذکر کیا۔ ۱۹۳۶ء میں شوکت تھانوی نے انہیں افسانہ لکھنے کی ترغیب دی۔ ۱۹۳۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا وہ سات بچوں کے لئے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے۔

ان کو سوتیلے والد سوتیلی ماں سوتیلے بھائی سے سابقہ پڑا لیکن وہ ان کی محبت و ایثار کا ہی ذکر کرتی ہیں۔ انہوں نے ماموں نانا کو بھی یاد کیا۔ تقسیم کے بعد ان کے نانا اپنا گھر کوڑیوں کے مول بیچ کر ان لوگوں کو لے کر پاکستان آگئے۔ وہاں احمد ندیم قاسمی نے ان کی سرپرستی کی۔ ان کی کہانیاں ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنے چار مجموعوں کا ذکر کیا۔ ان کے ناول پرابلیس آدم جی انعام ملا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی شادی ظہیر بابر سے ہوئی تھی وہ ایک بیٹے کی ماں ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سکریٹری بنی تھیں۔ انہوں نے سی آئی ڈی کے ہاتھوں پریشانیوں کا ذکر کیا۔ بہن ہاجرہ کے کراچی جانے کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں اپنے علاج کے لئے ۱۹۸۲ء میں لندن گئیں۔ جہاں ۲۴ جولائی کو ان کا انتقال ہوگیا۔ میت لاہور لاکر دفن کی گئی۔

خورشید نکہت مہاراشٹر کی مشہور افسانہ و ناول نگار خاتون

ہیں۔وہ چوپڑہ ضلع جلگاؤں میں پیدا ہوئیں۔جلگاؤں میں تعلیم حاصل کی۔پونا مین پیشہ تدریس وتعلیم سے منسلک ہوئیں۔افسانہ نویسی کا شوق تھا۔ان کے رومانی، سماجی، معاشراتی افسانے رسالہ بیسویں صدی وغیرہ میں شائع ہوئے۔ان کے چھ ناول اور چار ناولوں کے ترجمے اور ۱۱۹ کے قریب افسانے جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنے مختصر حالات زندگی رسالہ بیسویں صدی دہلی اور پونے میں اردو افسانہ از نذیر فتح پوری میں تحریر کیے ہیں۔

انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف واقعات خاندان، وطن، پیدائش، تعلیم، سروس، ادبی مصروفیات تحریر کیے۔عہد وماحول کے سماجی و معاشرتی حالات وشخصیات پر ان کی توجہ کم ہی رہی۔انہوں نے اشارۃً بتایا کہ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد اور حادثات کا شکار رہی۔زندگی کے المیہ کی تفصیل انہوں نے نہیں لکھی نہ ازدواجی زندگی کے جانب کوئی اشارہ کیا ہے۔وہ ریٹائرڈ ہوکر پونا میں زندگی گزار رہی ہیں۔اور لکھا ہے کہ والدین و بھائی بہنوں کے ساتھ رہتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شادی نہیں کی زبان واسلوب کی دلکش اور ندرت اور نم ناک فضا کے باعث یہ آپ بیتی دلکش ہے۔

ایک خودنوشت سوانح عمری ایک خاتون سعیدہ بانو احمد نے ڈگر سے ہٹ کر عنوان سے لکھی ہے۔سعیدہ بانو احمد پروفیشنل ادیبہ نہیں وہ آل انڈیا ریڈیو میں اردو نیوز ریڈر اور پھر اردو سروس سے منسلک رہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی ایک ایسی عورت کی حیثیت سے لکھی جس کی زندگی مختلف نشیب وفراز پر گزری اور جسے زندگی میں بڑے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

مشہور ادیب ونقاد وافسانہ نگار ڈاکٹر اختر اورینوی کی اہلیہ شکیلہ اختر بھی اچھی ادیبہ اور افسانہ نویس تھیں۔ضلع گیا، بہار کے قصبے اردل میں پیدا ہوئی تھیں۔اختر اورینوی سے شادی ہوئی وہ ۱۹۷۷ء میں فوت ہوگئے۔شکیلہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ان کے افسانے اور ناولٹ وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنی مختصر آپ بیتی لکھی ہے۔اس میں اردل قصبہ میں اپنی پیدائش اپنے والدین کے پڑھنے لکھنے کا شوق۔اپنی مدرسہ کی تعلیم۔اور افسانہ نویسی کے شوق کا ذکر کیا ہے۔

مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کی بیگم شوکت کیفی بھی ایک آرٹسٹ تھیں۔کیفی اعظم گڑھ میں ۱۴، جنوری ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے بمبئی آکر بس گئے۔۱۰، مئی ۲۰۰۲ء کو انتقال کیا۔شوکت کیفی حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ڈرامہ کا شوق تھا۔کیفی سے ملاقات کے بعد دونوں محبت میں مبتلا ہوئے۔شادی کرلی۔شبانہ اعظمی، اوران کے بھائی بابا اعظمی۔ان کی اولاد ہیں۔شوکت کیفی ایک پڑھی لکھی باصلاحیت فن کارہ ہیں۔بحیثیت ادیبہ وہ مشہور نہیں۔انہوں نے اپنی خودنوشت کی رہ گزر کے نام سے لکھی ہے۔ یہ ان کی بچپن اور جوانی کی یادوں کا مرقع ہے یہ یادنگاری (میمائرس) قسم کی خودنوشت ہے۔اس میں انہوں نے اپنے بچپن کے جاگیردارانہ ماحول اس کی حد بندیوں اور اپنی باغیانہ ومتحرقانہ خیالات کا ذکر کیا۔پھر کیفی سے شادی اور بمبئی آمد اور وہاں کی ادبی ثقافتی معاشرتی، فلمی تھیٹریکل سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔وہ ایک باصلاحیت، ذہین، باوقار خوش سلیقہ باحوصلہ خاتون تھیں۔ڈرامہ میں اداکاری، فلموں میں اداکاری کرتی رہیں۔کیفی کے ساتھ عسرت سے دولت تک کا سفر خوشی خوشی طے کیا۔انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنی زندگی کو قید کردیا ہے۔اس میں حسین ترین لمحے بھی ہیں۔اور الجھنیں وپریشانیاں بھی۔ان کے عشق کا بیان بھی ہے اور ازدواجی زندگی کی پریشانیاں، بچوں کی پرورش پرداخت کے مسائل بھی۔وہ اپنا (انڈین پیوپلس تھیٹر ایسوسی ایشن) اور فلم دونوں سے وابستہ رہیں۔اپنے شوہر اپنے بیٹے اور بیٹی سے والہانہ محبت اوران کے ساتھ گذاری زندگی کا دلکش ودلچسپ ومؤثر بیان اس میں ملتا ہے۔نجی گھریلو خاندانی زندگی کے ساتھ انہوں نے بیرونی سماجی، معاشرتی فلمی، ادبی زندگی کے حالات کوائف اور شخصیات کو بھی انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔یہ خودنوشت بڑی ہی خوبصورت، شگفتہ وشائستہ زبان و اسلوب میں تحریر کی گئی ہے۔ہم مصنفہ کے ساتھ ساتھ اس میں خود کو موجود پاتے ہیں۔

عہد حاضر کی معروف ادیبہ فکشن نگار صالحہ عابد حسین خانوادۂ حالی سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا وہ خواجہ حالی کی پرنواسی۔خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی، غلام السیدین کی بہن اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی اہلیہ تھیں۔ ۱۸، اگست ۱۹۱۳ء کو پانی پت میں پیدا ہوئیں۔۱۹۳۳ء میں سید عابد حسین سے شادی کے بعد دہلی آگئیں۔ ۸، جنوری ۱۹۸۸ء کو انتقال کیا وہ بڑی فعال ادیبہ تھیں۔انہوں نے کئی

افسانے، ڈرامے، اور ناول لکھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت سلسلۂ روز و شب کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ ناول کی تکنیک میں وسیع کینوس پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ان کی زندگی، خاندان، اقربا و احباب، شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی سیاسی و سماجی، مذہبی شخصیات اور عصری حالات و کوائف کی عکاسی بھی کچھ موجود ہے۔ اس میں ان کا کردار کی جگہ نمایاں ہے۔

روز و شب کا یہ سلسلہ ۱۹۱۳ء میں مصنفہ کی پانی پت میں پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ پھر علی گڑھ، داعی پور، میرٹھ اور پھر یورپ، جرمنی، امریکہ کا سفر طے کرتا ہے۔ خاندانی زندگی، حالی کا گھرانہ، عابد حسین جیسے عالم سے رشتہ، ادبی دلچسپی سرگرمیاں، ناول افسانہ ڈرامہ، خاکہ، تقاریر علمی ادبی کتب کی تصنیف و ترجمہ کا سلسلہ، سماجی سرگرمیاں خانگی حالات، شوہر سسرال کے حالات، پریشانیاں میں بیماریاں، ایثار قربانیاں، اولاد نہ ہونے کا غم، زندگی کی جدو جہد وغیرہ وغیرہ کے بیانات جا بجا بکھرے ملتے ہیں۔ کتاب سے صالحہ کی دل ں آویز محبت بھری، مخلص، انسان دوست شخصیت ابھرتی ہے۔ خوشیوں و غموں کی زندگی۔ کامیابیوں کے ساتھ ناکامیابیوں کا ذکر، دلی کیفیتوں کا اظہار سبھی کو بے تکلفی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ فنی سطح سے نیچے نہیں اتریں۔ یہ ان کی ۷۱ سالہ زندگی اور ۶۲ سالہ ادبی زندگی اور عہد و ماحول کی کہانی ہے۔ اردو خودنوشت میں ایک پیش بہا اضافہ ہے۔

صغریٰ مہدی کا شمار عصر حاضر کی مقتدر ادبی شخصیات میں ہوتا ہے انہوں نے اپنی خودنوشت حکایت ہستی کے عنوان سے لکھی ہے جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی اگر ایک طرف مصنفہ کی زندگی، حالات و کوائف عصری معاشرتی کی ایک ریکارڈ ہے تو دوسری طرف ان کے خاندان، عہد و ماحول و تہذیب و معاشرت اور شخصیات کی عکاسی بھی ہے۔ یہ آپ بیتی، مصنفہ کی نجی زندگی انفرادی و اجتماعی شہری و دیہاتی زندگی، معاشرت اور عصری حالات و کوائف و شخصیات کو پیش کرتی ہے۔ اسے تانیثی ادب میں اضافہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور ادیبہ عصمت چغتائی نے اپنی خودنوشت ایک آپ بیتیانہ ناول (Auto Biographical Novel) کی طرز میں لکھی ہے۔ یہ پہلے رسالہ آج کل دہلی میں ۱۹۷۰ء۔ ۱۹۸۰ء میں کئی قسطوں میں شائع ہوئی۔ اسے وہ مکمل نہ کرسکیں۔ یہ ادھوری رہ گئی۔ بعد میں اسے وارث علوی کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا گیا۔ نقادانِ فن کا خیال ہے کہ عصمت کو اپنی اس طرح کی آپ بیتی لکھنے کا خیال قرۃ العین حیدر کی خودنوشت، کار جہاں دراز ہے کی اشاعت اور مقبولیت سے آیا ہوگا۔ عصمت نے اپنی مختصر آپ بیتیاں کئی جگہ لکھیں جیسے رسالہ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں (جون ۱۹۶۴ء) فن و شخصیت کے آپ بیتی نمبر (مارچ ۱۹۸۰ء) یا رسالہ آج کل میں غبار کارواں کے عنوان سے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خودنوشت ان کی عمر کے ایک حصے پر مشتمل ہے۔ یہ مربوط، مسلسل، یا مکمل نہ ہونے کے باوجود ایک منفرد خودنوشت کہی جاسکتی ہے۔

عظیم فکشن نگار قرۃ العین حیدر نے ایک انوکھی خودنوشت جو ان کی فیملی ساگا (داستان خاندان) اور آپ بیتیانہ ناول و آپ بیتی ہے آپ بیتی اور فکشن کا نادر امتزاج ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے منفرد، دلکش و دلچسپ انداز میں اپنے خاندان، اپنے والدین اور خود کی زندگی کے حالات و کوائف کی کہانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدائی دو جلدیں تو مربوط و مسلسل تاریخی ترتیب رکھتی ہیں۔ لیکن تیسری جلد شاہراہ و حریر مختلف موضوعات پر تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کو انہوں نے نہایت وسیع کینوس پر طول زمانی و مکانی میں پیش کیا ہے۔ پہلی جلد میں انہوں نے اپنے بعید ترین اسلاف، آباو جداد کی تاریخ بیان کی ہے۔ واقعہء کربلا کے بعد جب آلِ حسین بکھرے تو ان کے ایک فرد وسط اشیاء ہوتے ہوئے وارد ہند ہوئے اور پھر ان کا خاندان دو شاخوں میں تقسیم ہوگیا۔ جو بعد میں ان کے والد اور والدہ کے اجداد بنے۔ اور ان کے میل کی صورت میں پھر ان کی یکجائی ہوئی۔ قرۃ العین نے یہ آپ بیتی پرانی یادداشتوں، مسودوں، خطوط، مطبوعہ کتب و رسائل کی مدد سے مرتب کی ہے۔ صدیوں پر محیط یہ کہانی ان کی والدہ و والد کے حالات، ان کی پیدائش، تعلیم تربیت والد کی وفات، پھر آزادی، اور پاکستان ہجرت کے بیان پر محیط ہے۔ دوسری جلد میں مصنفہ نے پاکستان کے قیام کے حالات، مصروفیات، سروس، شخصیات، غیر ممالک کے سفر اور مختلف سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد کے مشورے پر واپس اور بمبئی آجانے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کے حالات وہ تسلسل سے لکھ نہ سکیں۔ تیسری جلد ۳۸ متفرق ابواب کا مجموعہ ہے۔ جن کے موضوعات اور بیانات مختلف النوع ہیں۔ ان میں صرف اتنا ربط ہے کہ.....(بقیہ ص: ۳۷ پر)

محمد مختار عالم ۔ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی مانو، حیدرآباد

قطب شاہی دور میں فارسی تاریخ نویسی

فارسی تاریخ نگاری ہو یا عربی تاریخ نگاری دونوں کے اپنے اپنے اسلوب ونظریات ہوتے ہیں۔ان نظریات سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علوم وفنون اپنے اپنے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ سلاطین ہند کی تاریخ کو دیکھا جائے،تو ان تواریخ میں سلاطین، حکمران اور شہزادے کے حالات و واقعات قلم بند کرتے ہیں، ان کے خیالات وافکار و شاہی منصوبوں اور ان کی تفصیلات کو یکجا کرتے ہیں، جنگ و جدال، صلح وآشتی کے پیغامات کو اکٹھا کرتے ہیں۔لیکن فن تاریخ نگاری ثقافت وروایات کی شناخت اور پرکھ، اس کی نہج وعوامل، جغرافیائی، سماجی ومعاشرتی حدود میں اپنی پہچان آپ رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک مغل سے پہلے دوسرا مغل کے بعد۔ مغل سے پہلے جو تاریخی کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی وہ ''چچ نامہ،، ہے۔جس کو حمید الدین کوفی نے ۶۱۳ھ میں بغیر مصنف کے نام کے عربی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد طبقات ناصری مؤلف منہاج سراج ۶۵۷ھ، آثار دہلوی مجموعہ آثار تاریخی حضرت امیر خسرو ۷۲۵ھ اور تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔دوسرا دور مغل یا اس کے بعد کا ہے۔اس دور کو فارسی تاریخ نگاری کا سب سے اہم دور مانا جاتا ہے۔اس دور میں بھی بہت سی فارسی تاریخی کتابیں قلم زد ہوئیں، جس میں تاریخ رشیدی مؤلف مرزا حیدر کاشغری، تاریخ ہمایوں مؤلف ابراہیم بن جریر ۹۵۷ھ، تاریخ اکبری مؤلف محمد عارف قندھاری ۹۸۷ھ ،طبقات اکبری مؤلف خواجہ نظام الدین احمد ۱۰۰۲ھ، اکبر نامہ ابو الفضل ۱۰۰۴ھ، شاہ جہان نامہ محمد صالح کنبوہ، تاریخ دلکشا شیخ عنایت اللہ اور تاریخ شاہ جہانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۲۹۹ء میں علاء الدین خلجی کے ماتحت مسلمانوں نے سب سے پہلے دکن میں قدم جمایا تھا،لیکن اس کی حکومت دیرپا نہ رہی۔ بعد میں علاء الدین خلجی کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ (۱۲۹۹، ۱۳۲۰) نے دکن کو دوبارہ فتح کیا۔ چودہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں برصغیر کا اکثر حصہ محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱) کے زیر نگیں آ گیا تھا۔سلطان محمد بن تغلق نے ۱۳۴۲ء میں ظفر خان کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا۔اس نے دکن کے سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر دہلی سلطنت سے علاحدگی اختیار کر لی اور ۱۳۴۷ء میں علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کر کے خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

روز بروز علاء الدین حسن اپنی حکومت کی توسیع وترقی میں کوشاں رہا۔لیکن بعد میں چل کر بہمنی حکومت پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ پہلا خاندان عماد شاہی برار میں، دوسرا خاندان نظام شاہی احمد نگر میں، تیسرا خاندان برید شاہی بیدر میں، چوتھا خاندان عادل شاہی بیجاپور میں اور پانچواں خاندان قطب شاہی گولکنڈہ میں۔

قطب شاہی دور کا آغاز ۹۱۸ھ میں بدست قطب الملک سلطان قلی قطب شاہ ہوتی ہے اور اختتام ابوالحسن تانا شاہ پر ہوتی ہے۔ یہ دور بھی تاریخی اعتبار سے زریں دور میں شمار ہوتا ہے۔اس دور میں بہت ساری تاریخی کتابیں فارسی زبان و

ادب میں لکھی گئیں۔ان میں سے بعض کا ذکر میں ذیل میں کرتا ہوں تا کہ لوگوں کی ان تک رسائی ہو سکے۔

حدیقۃ السلاطین:

یہ کتاب جامعہ شناسی پر بہت اہم تاریخی دستاویز ہے۔اس کے مصنف مرزا نظام الدین احمد گیلانی ہیں۔انہوں نے علامہ ابن خاتون کے توسط سے عبداللہ قطب شاہ کے دربار تک رسائی حاصل کی۔مصنف نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہی کا مفصل ذکر کیا ہے۔یہ کتاب سالار جنگ میوزیم میں مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے،جس کا شمارہ نمبر MSS.369 ہے۔سید علی اصغر بلگرامی نے اس کو ترتیب دیکر ۱۹۶۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو سے اس کو شائع کرایا ہے۔

حدائق السلاطین فی کلام القوالین:

اس کے مصنف علی ابن طیفور بسطامی ہیں جو قطب شاہی دور کے آخری فرمانروا ابوالحسن تانا شاہ کے دور ۱۰۹۲ھ ۱۶۸۱ء میں تحریر کیا۔میں مصنف نے قطب شاہی دور کے علماء، فضلاء وشعراء کے ادب نوازی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں سالار جنگ میوزیم Mss no. 215 موجود ہے۔

مآثر قطب شاہی:

مصنف محمد عبداللہ نیشاپوری ہیں جو سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں (۱۶۱۲۔۱۶۲۶ء/۱۰۱۳۔۱۰۲۷ھ) تصنیف کیا ۔مصنف انہی کے دور میں گولکنڈہ وارد ہوئے اور مختلف عہدے پر فائز ہوتے رہے۔اس کتاب میں انہوں نے داخلی وخارجی حالات کا مفصل ذکر کیا ہے۔یہ کتاب سالار جنگ میوزیم میں مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔

برہان مآثر:

اس کا مصنف علی ابن عزیز اللہ طباطبائی ہے، جو کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں عراق سے دکن آیا اور قلی قطب شاہ کی ملازمت اختیار کی۔بعدہ قلی قطب شاہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر احمد نگر کے سلاطین کی ملازمت اختیار کر لی۔ برہان نظام شاہ کی فرمائش سے ۱۰۰۰ھ میں برہان مآثر کی تالیف کی، جیسا کہ اس کے نام کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کتاب کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔طبقۂ اول میں سلاطین گلبرگہ، طبقۂ دوم میں سلاطین بیدر (محمد آباد) اور طبقۂ سوم میں سلاطین احمد نگر کا ذکر ہے۔یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

گلشن ابراہیمی (تاریخ فرشتہ):

اس کے مصف محمد قاسم فرشتہ ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء استرآباد ایران میں پیدا ہوئے لیکن ایام جوانی میں ہی اپنے والد غلام علی ہندو شاہ کے ہمراہ احمد نگر چلے آئے۔چند سال سکونت کے بعد ہی دبیروں کے زمرے میں شامل ہوگئے۔چونکہ اس وقت احمد نگر میں جنگ وجدال کا ماحول گرم تھا اس لئے وہاں سے بھی ہجرت کر کے بیجاپور چلے آئے اور محض انتالیس سال کی عمر میں ایک مدبر سیاسی کی حیثیت سے اپنی شناخت بنالی۔احمد نگر میں ان کے دوست شاہ نواز خان شیرازی تھے۔فرشتہ ان کے توسط سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں متعارف ہوئے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی روضۃ الصفا (مصنف خواندمیر) کا ایک نسخہ قاسم فرشتہ کو دیا اور اسی کے طرز پر ایک تاریخی کتاب لکھنے کی التجا کی۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ کا تصنیفی سفر یہاں سے شروع ہوتا ہے۔اس کتاب میں فرشتہ نے ہندوستان کے قدیم عقائد، مذاہب، رسم و رواج اور حکمراں کے حالات سے لیکر قطب شاہی دور تک کی تاریخ لکھی ہے، جو بہت ہی قابل متدین تاریخ مانی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے ترجمے اردو وانگریزی میں کئی مرتبہ شائع ہوئے۔

تاریخ سلطان محمد قطب شاہ:۔ (مصنف نامعلوم)

نہرو آڈیٹوریم مدینہ ایجوکیشنل حیدرآباد میں تصانیف سید جعفر امیر و ڈاکٹر سمیہ تمکین کی کتابوں کے رسم رونمائی کا منظر۔ ادارہ ڈاکٹر سمیہ تمکین اور سید جعفر امیر کو اردو کی اس اہم خدمات پر مبارکباد پیش کرتا ہے

دوروزہ بین الاقوامی دکنی کانفرنس عثمانیہ یونیورسٹی کالج فار ویمن کوٹھی حیدرآباد میں قمر جمالی کی صدارت میں مینی افسانہ اور مائیکرو فکشن پر ایک نشست کا منظر۔ ادارہ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ کو کامیاب سمینار پر مبارکباد پیش کرتا ہے

یہ کتاب سلطان محمد قطب شاہ کے ایما پر ۱۰۲۵ھ اور ۱۰۲۷ھ کے درمیان میں لکھی گئی۔ بہت تلاش وجستجو کے بعد بھی اس کے مصنف کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ کتاب کے شروع میں ایک طویل دیباچہ لکھا گیا ہے لیکن اس میں بھی مصنف نے اپنا نام درج نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی دوسری تاریخی کتب میں اس کتاب کے مصنف کے بارے میں کوئی سراغ موجود ہے۔

قطب شاہی دور میں جتنی بھی تاریخی کتابیں وجود میں آئیں ان میں سب سے اہم مآخذ یہی کتاب ہے۔ جس میں قطب شاہی سلاطین کے آباء واجداد، قراقوینلو اور آغر خان سے لیکر قطب شاہی دور کے چھٹویں فرمانروا سلطان محمد قطب شاہ (بانی مکہ مسجد) تک کے تاریخی حالات کے ساتھ مذکور ہیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ، چار مقالہ اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں رستم زمان واسکندر دوران قرا محمد یوسف اوران کے آباء واجداد کا تفصیلی ذکر ہے۔ پہلے مقالے میں شاہزادہ ارجمند سلطان قلی قطب الملک اور انکی حکمرانی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے مقالے میں جمشید قطب الملک اور اس کے بیٹے سبحان قلی کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرے مقالے میں عالی حضرت، فریدون حشمت ،سلیمان شوکت، بادشاہ جم سریر، ابوالمنصور رابراہیم قطب شاہ کا تدبر مملکت وحکمت عملی کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے مقالے میں سلیمان مکانی، خاقان زمانی، ابوالمظفر سلطان محمد قطب شاہ کے تدبر وحکمت عملی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب بہ اعتبار موضوع فن تاریخ میں ہے لیکن اس کا اسلوب بیان ادبی معلوم ہوتا ہے۔ اکثر جگہوں پر مصنف نے سلطان محمد قطب شاہ کے اشعار نقل کئے ہیں اور متعلقہ بادشاہ کی ادبی، سماجی وتہذیبی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ میں نے اس کتاب کو سلطان محمد قطب شاہ کے ایما وفرمائش پر تصنیف کی ہے اور یوں رقم طراز ہے کہ:

آباء واجداد آن عالی مقدار کہ سابقا یکی از چاکران این درگاہ در ضوابط احوال ایشان نوشتہ بود

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں کسی مورخ نے قطب شاہیوں کی مفصل تاریخ مرتب کی تھی اور تاریخ سلطان محمد قطب شاہ کے مصنف کے پیش نظر مآخذ کی حیثیت سے وہی کتاب موجود تھی۔ چنانچہ اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے مصنف نے اس کتاب کو اپنی طرز نگارش میں قلم بند کیا ہے۔

محمد عامل بدایونی۔ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ضیا احمد بدایونی بحیثیت ناقد

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا شمار عصر حاضر کی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔آپ بیک وقت شاعر، شارح، مترجم، نثر نگار، مضمون نگار اور نقاد ہیں۔آپ کی پیدائش ۲۱ر دسمبر ۱۸۹۴ء کو محلہ مولوی ٹولہ، بدایوں میں ہوئی۔والد کا نام رفیع احمد عاؔلی تھا۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قبل آپ نے عربی، صرف، نحو، منطق اور حدیث کا علم مولانا محبّ احمد قادری، مولانا محمد ابراہیم قادری اور مولوی یونس علی صاحبؒ سے حاصل کیا۔کچھ سبق مولانا شاہ مطیع الرسول عبدالمقتدرؒ سے بھی پڑھے۔۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔یونورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔مختلف کالجوں اور یونیورسٹی میں ملازمت کی۔آخر کار شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔۱۹۵۹ء میں صدر شعبہ اور پروفیسر کے منصب سے نیک نامی کے ساتھ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔لیکن تمام عمر تصنیفات وتالیفات کے کاموں سے وابستہ رہے۔آپ کی تصنیفات وتالیفات کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

تذکار سلف، تجلیات، شرح قصائد مومن، شرح دیوان مومن، قول سدید، مکتوبات، سمن زار، مباحث ومسائل، مسالک ومنازل اور جلوۂ حقیقت۔

آپ کو اپنے بردار بزرگ جناب رضی احمد رضؔی بدایونی سے تلمذ حاصل تھا۔شاعری کے دو مجموعے ''تذکار سلف'' اور تجلیات'' شائع ہو چکے ہیں۔آپ کا انتقال ۱۷ر جولائی ۱۹۷۳ء کو علی گڑھ میں ہوا۔آپ نے فارسی اور اردو ادب کی خوب آبیاری کی۔آپ کے متعدد شاگرد ایسے ہیں جو آسمان علم وادب پر درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہوئے۔ان میں سے چند کے اسم گرامی حسب ذیل ہیں:

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، پروفیسر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی

سید حامد حسن، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شمس الدین صاحب، وزیر کشمیر

مسٹر منظور عالم، کلکٹر باندہ

ڈاکٹر غلام سرور، صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی

آپ کے دو ادبی وتنقیدی مجموعے ''مباحث و مسائل'' اور ''مسالک ومنازل'' شائع ہوچکے ہیں۔ان کے علاوہ ''جلوۂ حقیقت'' اور آئینۂ حق نما'' مذہبی موضوعات پر مشتمل مضامین کے مجموعے ہیں۔ضیا احمد بدایونی نے فارسی شعروادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور مشرق ومغرب کے تنقیدی اصولوں پر بھی گہری نظر رکھی۔جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا پہلے اس موضوع کی تحقیق کی اور بعد میں تنقید کے مراحل طے کیے۔سوال یہ ہے کہ تنقید کیا ہے؟ کسی فن پارے کو پڑھ کر اس کے محاسن ومعائب کا پتہ لگا کر فن پارے اور فن کار دونوں کے تعین قدر طے کرنے کو تنقید کہتے ہیں۔پروفیسر آل احمد سرور تنقید کی وضاحت ان لفظوں میں کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید انتخاب کا نام نہیں مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ضرور ظاہر ہوتا ہے۔تنقید وہ سب کام کرتی ہے

جوایک مورخ، ماہرنفسیات، ایک شاعراور ایک پیغمبر کرتا ہے۔تنقید وضاحت ہے،صراحت ہے،ترجمانی ہے ، تشریح ہے،تحلیل ہے،تجزیہ ہے۔تنقید قدریں ہی نہیں متعین کرتی ہے ادب اور زندگی کوایک پیمانہ بھی دیتی ہے۔انصاف کرتی ہے اورادنیٰ اور اعلیٰ ،جھوٹ اور سچ، بلند اور پست کے معیار بھی قائم کرتی ہے۔''(پروفیسر آل احمد سرور،تنقید کیا ہے)

ضیا احمد کا اندازِ تنقید تشریحی اور توضیحی ہے۔یعنی وہ تنقید کرتے وقت وضاحت وصراحت سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک ایک گرہے کودھیرے دھیرے کھولتے جاتے ہیں۔''مباحث و مسائل'' پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جو'مجلس اشاعت ادب، دہلی' سے پہلی بار۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔اس میں مختلف موضوعات پر۳۰ر مضامین اور۲ر تبصرے شامل ہیں۔یہ تمام مضامین ہندو پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔مجموعے میں شامل مضامین'کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے'؟ اور تصوف قرآن کی روشنی میں''اس لیے اہم ہیں کہ ان میں ضیا احمد نے تصوف کے ماخذات پر مدلل بحث کی ہے۔قرآنی آیات کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ تصوف کے بارے میں قرآن مجید کی آیات کیا کہتی ہیں؟ ضیا احمد نے لکھا ہے کہ تصوف نا تو سامی مذہب کے خلاف آریائی دماغ کا ردعمل ہے اور نہ صوفیانہ مسیحی افکار کے رہین منت ہے بلکہ تصوف عین تعلیمات اسلامی کا خلاصہ اور ارشادات کتاب سنت کا عطر ہے۔

''فوق البشر کا تصور اور اسلام'' اور'' فوق البشر اور مرد مومن''میں ضیا احمد نے اقبال کا فلسفۂ خودی، تصور فوق البشر، اقبال اور نیٹشے کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔انھوں نے اقبال اور نیٹشے کے خیالات میں تضاد بتایا ہے کہ نیٹشے خدا کی ذات کا منکر ہے اور اقبال خدا کی ذات کو ماننے والے۔اسی طرح ضیا احمد نے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔

ضیا احمد بدایونی نے چند مضامین شخصیات پر بھی لکھے ہیں۔جن میں کلیم الدین ،انشاء اللہ خاں انشاؔ،نظیر اکبرآبادی،منیر شکوہ آبادی،احسن مارہروی اور مرزا غالب ،حسرت موہانی، فانی بدایونی اور علامہ اقبال کے نام قابل ذکر ہیں۔ان مضامین میں شعرا کی سوانح سے متعلق مدلل مواد شخصیت اور ان کے کلام پر تنقیدی رائے دی گئی ہے۔ضیا احمد بدایونی کو مومن کا سنجیدہ نقاد اور شارح مانا جاتا ہے انھوں نے حکیم مومن خاں مومنؔ پر چار مضامین لکھے اور ان کے کلام کی شرح بھی لکھی۔مضامین درج ذیل ہیں:

مومن پر ایک نظر

کلام مومن کا نفسیاتی مطالعہ

مثنویات مومن

مومن کی طنزیہ شاعری

کلام مومن کا نفسیاتی مطالعہ مومن پر لکھا گیا ایک اہم مقالہ ہے جو ان کی مرتبہ کتاب ''دیوان مومن''(مع شرح) میں شامل ہے۔اس مضمون میں ضیا صاحب نے مومن کے کلام کی خوبیوں کی نشاندہی کی ہے اور کلام مومن کا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔ضیا احمد کے نزدیک کلام مومن کی خوبیوں میں مکر شاعرانہ،طنز، نازک خیالی اور مضمون آفرینی اہم ہیں۔

نظیر اکبرآبادی پر لکھا گیا مضمون قابل توجہ اس لیے ہے کہ اکثر نظیر کے مرتبہ کو لے کر سوال اٹھتا آیا ہے کہ اردو شاعری میں نظیر کا کیا مرتبہ ہے؟ ضیا احمد نے نظیر کے مرتبے اور مقبولیت میں اضافہ کیا اور انھیں سعدیؔ اور شکسپیر کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ضیا احمد نے مستند تذکرہ نگاروں کی رائے کو مدنظر رکھتے

ہوئے جرأت کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے اور ایک جامع مضمون ان کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میر حسن اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جو کچھ جرأت کے بارے میں لکھ دیا ہے وہ پتھر کی لکیر ہے۔

فانی پر جو مختصر مضمون ملتا ہے اس میں فانی کی حیات کے بارے میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ فانی کی سوانح سے متعلق مواد دوسرے ناقدین کے یہاں کم ملتا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ اگر چہ آخر میں زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں نے بالکل فانی کا دل بجھا دیا تھا لیکن وہ ہمیشہ سے افسردہ طبیعت نہ تھے۔

ایک مضمون ملا عبدالقادر بدایونی پر بھی ہے۔ ملا عبد القادر بدایونی، ضیا احمد کے نزدیک ایسے صاحب عظمت بزرگ ہیں جنھوں نے اکبر اعظم کی شخصی سلطنت اور دین الٰہی کے زبر دست سیلاب کے آگے اپنا سر نہ جھکایا۔ ضیا احمد نے علامہ اقبال سے متعلق تین مضامین لکھے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

کیا اقبال تصوف کے مخالف تھے؟
اقبال کے کلام میں عشق کا تخیل
اقبال اور حسن الفاظ

''مباحث و مسائل'' کے تمام مضامین پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے علمی تجربے، گہرے مطالعے، ناقدانہ صلاحیت اور ذوق تحقیق کا پتہ دیتے ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے بڑے سلجھے انداز میں اس موضوع سے متعلق تمام گتھیوں کو حل کر دیا ہے۔

''مسالک و منازل'' پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا دوسرا تنقیدی مجموعہ ہے جو پہلی بار مئی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ حالانکہ یہ مجموعہ ضیا احمد کی زندگی میں طبع ہونا چاہیے تھا۔ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی اور یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اس مجموعے میں کل ۱۲ مضامین شامل ہیں۔ جن میں پہلے چار مضامین فارسی ادب اور اس کے ارتقا سے متعلق ہیں۔ ایک مضمون مخطوطہ شناسی پر ہے۔ باقی ۷ مضامین فارسی ادب کے شعرا سے متعلق ہیں۔ ''مسالک و منازل'' کے تمام مضامین ضیا احمد کے فارسی ادب کے گہرے مطالعہ، ناقدانہ صلاحیت اور ذوق و جستجو کا پتہ دیتے ہیں۔ کتاب میں شامل مضمون ''ارتقائے ادب فارسی عہد اکبری میں'' اس لیے اہم ہے کہ اس مضمون کے مطالعہ سے عہد اکبری میں فارسی شعر و ادب کے ارتقا اور اس دور میں لکھی گئی تصانیف کے بارے میں کافی مواد ملتا ہے۔ انھوں نے عہد اکبری میں فارسی ادب کے ارتقا پر تحقیقی اور تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ قصیدہ اور مثنوی کے ارتقا پر بھی چند باتیں رقم کی گئی ہیں اور بتایا ہے کہ اس عہد میں ان دونوں اصناف نے خوب ترقی کی۔ اردو نثر اور نظم کے بارے میں بڑی مفصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس عہد میں نثر پر نظم مقدم رہی ہے۔ نثر میں نپے تلے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے لیکن اب نثر مبالغہ آمیز لکھی جانے لگی ہے۔ دوسرا مضمون فارسی شاعری اور ہجویات پر ہے۔ ہجو، مدح کی ضد ہے۔ جس طرح مدح کے لیے تخیل اور بلند پرواز کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہجو کے لیے بھی تخیل اور بلند پرواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں واعظ یا ناصح کو ہجو کا نشانہ بنایا جاتا ہے یہ روایت ایران سے فارسی ادب کے ذریعہ اردو ادب میں شامل ہوئی ہے۔ کتاب میں شامل ایک اور مضمون جدید فارسی شاعری کے رجحانات سے متعلق ہے۔ حالات تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے رجحانات اور مسائل میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ اس کے موضوعات بدل جاتے ہیں اور نئے نئے خیالات جگہ پانے لگتے ہیں۔ ضیا احمد کا خیال ہے کہ اب رسمی غزل گوئی اور قصیدہ نگاری کے محل بوسیدہ ہونے لگے کیوں کہ قصیدہ درباری مذاق کی

چیز تھی۔ اب لفاظی، تصنع، مبالغہ خود بخود ختم ہو گئے اور اس کی جگہ اختصار اور سادگی و بے ساختگی نے لے لی۔ جدید شاعری درباری اثرات سے الگ اور حکومت کے قید و بند سے آزاد ہے۔ اس مجموعے میں فارسی زبان و ادب کے شعرا پر بھی مقالات شامل ہیں۔ ان میں منوچہری، وافغانی، نظامی، فیضی، ظہور اللہ، حکیم مومن خاں مومن اور مولانا صہبائی کے نام ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا مقالے میں ضیا احمد بدایونی کے تمام مضامین کا احاطہ کر پانا مشکل ہے۔ اس لیے راقم نے چند مضامین پر مختصر گفتگو کر ضیا احمد بدایونی کی ناقدانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ الغرض اس مختصر گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ضیا احمد ایک بلند پرواز نقاد ہیں۔ انھوں نے انوکھے اور اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، جس سے ان کی ادبی صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی لگایا سکتا ہے۔

بقیہ ص: ۳۰ کا

ان میں مصنفہ کی ذات موجود ہے۔ یہ حالات و واقعات ان کو پیش آئے ہیں۔ پرستان تھیٹر، رسالہ گل آباد، بیگم کا رسیا، کشکول عنقا شاہ قوم فقیر، اسنوبری کے شگوفے، سیر کہسار، گمنام طائر حرم لیگ سلام لیگ، ایک عہد ساز ادا کارہ وغیرہ کئی عنوانات کے تحت مختلف حالات واقعات کو انگوٹھی نگینوں کی طرح جڑے گئے ہیں۔ پوری تحریر ایک عجیب سحر انگیز دنیا کی سیر کراتی ہے۔

اس طرح اردو میں بے شمار خواتین قلمکاروں نے خودنوشتیں لکھی جن میں سے چند کا ذکر یہاں کیا گیا۔ اس مختصر مقالے میں تمام کا احاطہ کرنا اور اس پر تفصیلی گفتگو کرنا یقیناً ممکن نہیں۔ انھیں کلمات کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی ہوں۔

جامعة البنات الاصلاحية حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دو سال) ★ شعبہ عالمیت (چار سال) ★ شعبہ فضیلت (دو سال)

☆ شہر سے اہم مقامات سے آمد و رفت کی سہولت ☆ دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆ عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:

JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأة الصالحة" ٹیم کی تیاری۔

☆ شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعة البنات الاصلاحية حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

سید عظمت اللہ بیابانی ۔ وجے نگر کالونی، حیدرآباد

ہمارا ملک

اگر کوئی کہے کہ ہندوستان ساری گلوب کے لیے ایک گلدستہ ہے، تب کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ہمارا ملک جو سونے کی چڑیا کے نام سے جانا جاتا ہے، اس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں۔ سماجی، تہذیبی، اخلاقی، مذہبی، اور زبانی حیثیت جدا جدا ہونے کے باوجود آپس میں ایسے ملے جلے رہتے ہیں جیسا کہ شیر وشکر۔ دنیا کے کسی شہر میں اتنی تعداد میں الگ الگ تہذیب وتمدن نہیں ہوں گے جتنے کہ اپنے وطنِ عزیز میں ہیں۔

مغربی ممالک کی اکثریت ''گوروں'' پر مشتمل ہے تاہم ان مغربی ممالک میں اعداد کے لحاظ سے بہت کم آبادی ہے۔ ہمارے ملک عزیز میں ان کے مقابلے رقبے کے اعتبار سے آبادی بہت ہے۔ آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے آپسی بھائی چارہ خونی رشتے سے زیادہ مستحکم ہے۔ اس خوبصورت سنگم کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مشہور شاعر علامہ اقبالؔ نے کہا ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہمارے ملک کی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا ہے۔ دریائے گنگا اور جمنا شمالی ہندوستان کو سیراب کرتی ہیں، دریائے گوداوری اور کرشنا ملک کے درمیانی حصہ کو اور دریائے کاویری جنوبی ملک کو۔ یہ ملک تقریباً آٹھ سو سال تک مغل بادشاہوں کے تحت تھا۔ ملک ہندوستان کو بہت خوبصورت اور شاندار عمارتوں سے سجایا، لمبی لمبی سڑکیں تعمیر کیں، جس کے دونوں بازو سایہ دار درخت لگائے، جگہ جگہ مسافروں کے آرام کے لیے سرائے تعمیر کیے، لیکن برطانوی راج کے ڈھیر سو سالہ دورِ حکومت میں یہاں کی آبادی کا شیر وشکر کی حیثیت سے دیکھ کر آپس میں پھوٹ ڈالنا شروع کیا۔ جنگِ آزادی کی شروعات میں جب یہاں کی عوام آپس میں بغیر کوئی بھید بھاؤ کے مل کر حکومتِ برطانیہ کے خلاف اکٹھے ہوگئے، تب انہوں نے اس متحد قوم کو آپس میں لڑانے کے لیے ''سور'' اور ''گائے'' کی مدد لی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک مجاہدِ آزادی برطانوی حکومت کے ایک عدالت میں اس سوال پر کہ مغلوں کی آٹھ سو سالہ حکومت میں کبھی کوئی بم ڈالا نہیں گیا اور اب کیوں بم کا استعمال کیا گیا، اس مجاہد آزادی نے جواب میں یہ کہا کہ میرا بم کا استعمال لوگوں کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ بم کی آواز سے برطانوی حکومت کے بہرے کانوں تک آواز پہنچانا۔ تاریخ یہ بھی بتلاتی ہے کہ ان آزادی کی پہلی کوششوں میں قوم کے مجاہد آزادی جو دو الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، عدالت کے فیصلے میں ایک ہی پھندے سے وقتِ واحد میں پھانسی لی۔

یہ ہے ہمارا ملک، جہاں کئی قسم کے خوشنما پھولوں سے بنا ہوا گلدستہ ہے، جس میں الگ الگ قسم کے رنگ وبو سے لدے ہوئے پھول ہیں۔ آج کی نوخیز نسل کے لیے انڈیا گیٹ پہ کندہ کیے ہوئے بہادرانِ وطن کے ناموں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح مذہب، رنگ وملت کے جدا ہونے کے باوجود ایک مکمل مجسمہ بنے ہوئے ملک کی خدمت میں شہید ہوئے۔ یہاں کے شعراء کرام جو الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی اس ملک کی مدح میں بہت سے اشعار کہے ہیں ؎

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی اُلفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

لال چند فلکؔ

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزہ دامنِ مدار کا ہے مٹی کے دامن میں

برج نارائن چکبستؔ

دلوں میں حُبِ وطن ہے اگر تو ایک رہو
نکھرنا یہ چمن ہے اگر تو ایک رہو

جعفر ملیح آبادی

نزاکت حسین۔ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

دواؤں کے پودوں کی اہمیت

عالمی ادارہ صحت کے بیان کے مطابق دواؤں کے پودوں کے استعمال ساری دنیا میں دن بہ دن بڑھتا رہتا ہے۔ ہندوستان دنیا میں وہ اکیلا ملک ہے جو اس میں 2500 نوع دواؤں کے پودوں یافت ہوتا ہے۔دواؤں کیپودوں کوقدیم زمانیسے ہی صحت کی دیکھ بھال میں استعمال کیا جاتا رہاہے۔ابتدئزمانہ سے انسان اور پودوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔انسان پودوں سیخوراک،لباس اورایندھن حاصل کرتا رہاہے۔خاص کر بیماری کی صورت میں بھی وہ ان پودوں کو ہی بطور دوا استعمال کرتا تھا۔عام بیماریوں سیبچنیمیں دواؤں کیپودوں کی جگہ پرائمریہیلتھ کیئر(پی ایچ سی) کیپانچ بنیادی اصولوں کے تحت مزید جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ دواؤں کے پودے بیماری کی روک تھام اوران کے فروغ اور حالیہ روک تھام کی تمام حکمت عملیوں میں فٹ ہونیکیلیےاہم کردار ادا کرتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ انسان کی بیماری کا علاج اس مٹی سیاگنیوالے پودوں سے بہتر کسی چیز سے نہیں ہوسکتا جس مٹی سے اس کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔صدیوں تک انسانوں کے علاوہ جانوروں کا علاج بھی پودوں ہی سے کیا جاتا رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جیسے سائنس نے ترقی کی تو جہاں اورشعبوں میں تحقیقات ہوئیں وہاں طبی علوم میں بھی تحقیق کی روشنی میں نئی نئی دریافتیں ہوئیں۔ پودوں سے حاصل شدہ ادویات کی جگہ مصنوعی طریقے سے تیار شدہ ادویات زور اثر تھیں اس لیے انہوں نے پودوں سے حاصل شدہ قدرتی ادویات کی جگہ لے لی مختف اداروں نے ادوات کو مصنوعی طریقے سے تیار کرنے کو بطور ایک کاروبار کے اپنالیا اور یہ کاروبار ایسا بڑھا کہ فطری طریق علاج کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ گوان مصنوعی طریقے سے تیار شدہ ادویات سے مختلف بیماریوں کے علاج میں کافی آسانی ہوگئی لیکن جلد ہی ان ادویات کے مضر اثرات سامنے آنے لگے اور تجربات سے معلوم ہوا کہ ان ادویات کا فائدہ کم نقصان زیادہ ہے اس لیے اب انسان اسی قدرتی اور فطری علاج کی طرف پلٹ رہاہے۔ پودوں سے تیار شدہ ادویات کا استعمال روز بروز بڑھ رہاہے۔جس سے ان ادویات میں استعمال ہونے والے پودوں کی طلب میں کئی گنا اضافہ ہوگیاہے اور نباتاتی ادویات کی خرید وفروخت نے ایک تجارت کی شکل اختیار کرلی ہے۔اس وقت تقریباڈیڑھ سے ڈھائی سے نباتاتی ادویات کے مختلف فارموکوپیا میں تحقیقی شواہد پر مبنی مجرب اور مستند ادویات کے طور پر درج کی جاچکی ہیں اور مختلف کمپنیوں نے ان کو مغرب خاص طور پر جرمنی،اٹلی،برطانیہ اور آمریکہ میں بطور موثر ادویات متعارف کرواناشروع کردیا ہے۔اس وقت تک ان نباتاتی ادویات کی خرید وفروخت تقریبا200 بلیں امریکی ڈالر تک جاپہنچی ہے۔ایک سروی کے مطابق جوڈبلیواوٹی کی طرف سے

ملک سال	ایران	ہند	سوریہ	ترکیہ	سنگاپور	چین
1995	9342/0	9800/0	7820/0	8223/0	7484/0	3098/0
1996	9596/0	9663/0	8180/0	8170/0	8032/0	1605/0
1997	9171/0	9571/0	8988/0	8605/0	7505/0	0125/0-
1998	9610/0	9545/0	8229/0	8860/0	6868/0	1042/0-
1999	9464/0	9628/0	8370/0	8565/0	8107/0	1136/0-
2000	9155/0	9805/0	8985/0	8446/0	8045/0	0468/0-
2001	8836/0	9895/0	8649/0	8108/0	8161/0	1144/0
2002	8921/0	9868/0	7851/0	8659/0	7349/0	0028/0-
2003	9461/0	9849/0	8111/0	8165/0	8060/0	0223/0
2004	9334/0	9755/0	8899/0	7863/0	8246/0	1332/0
2005	9065/0	9822/0	8657/0	7265/0	7191/0	1217/0
2006	8210/0	9879/0	8593/0	5607/0	6652/0	1058/0-

شایع ہوا ہے نباتاتی ادویہ کی برآمدات کو بیان کرتا ہے۔حسب ذیل جدول:

اللہ تعالی نے ہندوستان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے،اس کو ایسی زرخیزی بخشی ہے کہ یہاں ہر قسم کی فصل اگ سکتی ہے۔ہندوستان میں ادویاتی پودوں کی کاشت گو محدود پیمانے پر ہورہی ہے مگر زیادہ تر ان کو جنگلات اور پہاڑی علاقوں سے بطور جڑی بوٹیوں کے اکٹھا کیا جاتا ہے۔اس وقت جہاں عام فصلوں مثال کے طور پر چاول، کپاس اور غیرہ کی پیداوار بڑھانے کی سخت ضرورت ہے۔ایسی فصلوں کی کاشت کو رواج دینا بھی ضروری ہے جو مقدار کے لحاظ سے تو کم استعمال ہوتی ہے۔لیکن ان کی اہمیت کسی طرح بھی کم نہیں۔ہندوستان کی ستر فیصد آبادی دیہات میں آباد ہے جن کا زیادہ تر انحصار نباتاتی ادویات پر ہے۔ان نباتات کو مختلف بیماریوں کے علاج میں بہت مفید پایا گیا ہے حتی کہ ایسے پودے دریافت ہوچکے ہیں جو کانسر،شوگر،خون کی بیماریوں، دل کی بیماریوں،یرقان، السر اور جگر کی کئی اہم بیماریوں میں مفید پائی گئی ہیں اور ہزاروں لوگ ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔ضرورت اس امر کی یہ ہے کہ ان ادویاتی پودوں کی کاشت سائنسی بنیادوں پر بطور فصل کی جائے تا کہ نہ صرف ان کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کیا جاسکے بلکہ ان کی کاشت سے کسان کی آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوسکے۔نباتاتی پودوں کی کاشت کی اہمیت کے پیش نظر یہ تحقیق میں مرتب کیا گیا جس میں مختلف ادویاتی پودوں کو کاشت کرنے کے سائنسی طریقوں کی وضاحت کی گئی ہے۔اس میں چیدہ چیدہ طبی خواص وفوائد بھی تحریر کئے گئے ہیں تا ہم ان کا بطور دوا استعمال مستند طبیب کے مشورہ سے کیا جائے۔

Phyllan Thus Emblica اور اس کا نباتاتی نام ہے Indian Goose Berry آخر میں بے شمار نباتاتی پودوں میں سے ایک کے بارے وضاحت کریں گے: آملہ جو اس کا انگریزی نام ہے:

خواص: آملہ کے سو گرام قابل خوردنی حصہ میں 8 ۔81 فیصد پانی،5۔0 فیصد پروٹین،1۔0 فیصد چکنائی، 5۔0 فیصد معدنیات، 4۔3 فیصد نشاستہ ہوتا ہے، اس کے پھل میں کیلشیم، فاسفورس، ہاسین، اور وٹامن سی خاصی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

طبی نقطہ نظر سے آملہ کا پھل بہت اہمیت کا حامل ہے اس کے پھل میں وٹامن سی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔وٹامن سی کی بہتات رکھنے کی وجہ سے آملہ ذیابیطس پر قابو پانے میں بہت موثر ہے۔آملہ کے پھل کا مربہ دل ودماغ اور بصارت کے لیے بہت مفید ہے۔آملہ بالوں کی نشوونما میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدرتی رنگت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔آملہ سانس کی بیماریوں خاص کر آج کل کی بیماری (کورنا وائرس) اور برانکائٹس وغیرہ کا موثر علاج ہے۔

آملہ درمیانی قد کا ایک خوب صورت درخت ہے، جس کا پھل گول بیر کی شکل کا ہوتا ہے۔جس کی چھ پھانکیں ہوتی ہیں۔آملہ کی کاشت کے لیے گرم مرطوب ہوا ضروری ہے یہ نیم گرم مرطوب علاقوں میں بھی کاشت کیا جاسکتا ہے آملہ کا درخت سدا بہار بھی جاتے ہیں۔آملہ ہر قسم کی زمین میں کاشت کیا جاسکتا ہے۔آملہ کی افزائش نسل بذریعہ بیج ہے۔تو آملہ بیج سے اگا کر لگایا جاتا ہے تاہم بیج سے اگا کر لگائے گئے پودوں کا پھل چھوٹا اور ادنی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔نباتاتی طریقہ سے اگایا ہوا آملہ کا پھل اعلی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔افزائش کے نباتاتی طریقے حسب ذیل ہے:

شاخوں کی 9 تا 12 انچ قلمیں کاٹی جاتی ہیں اور کچھ پتے بھی قلم کے ساتھ رہنے دیتے جاتے ہیں۔قلم کا نچلا حصہ آنکھ کے نزدیک سے گول کاٹا جاتا ہے جبکہ اوپر کا حصہ ترچھا کاٹا جاتا ہے جو کہ آنکھ سے ڈیڑھ انچ لمبا ہوتا ہے ان قلموں کو گیلی ریت میں لگایا جاتا ہے کہ جڑیں پھوٹ آئیں پھر ان قلموں کو 2/3 حصہ تک اچھی طرح تیار شدہ زمین میں دبادیا جاتا ہے۔

گاندھی جی
اردو ادباء وشعراء کی نظر میں

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

نام کتاب: گاندھی جی اردو ادباء وشعراء کی نظر میں
مرتب: مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی
تبصرہ نگار: ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
ضخامت: ۲۸۰
قیمت: ۴۰۰ روپے

کوہی مہاتما وہی شہید امن وآشتی
پریم جس کا زندگی، خلوص جس کا پیرہن
(جگر)

اہنسا، عدم تشدد اور امن آشتی کے پیامبر موہن داس کرم چند گاندھی گوناگوں خصوصیات کے حامل ایک عظیم مذہبی وسیاسی قائد، مجاہد آزادی اور سماجی مصلح تھے۔ ان شخصیت، اوصاف، کردار اور افکار بذاتِ خود دنیا کے اہم مذاہب کی روحانیت اور عالمی سطح کے اخلاقی نظام کا ایسا خوبصورت گلدستہ ہے کہ جس کے ذریعہ انسان میں خدا کے روبرو جواب دہ ہونے اور نیکوکاری اختیار کرکے بندوں کا خدمت گزار بنانے کے جذبے کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ہندوستان کے بے شمار زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں نے مہاتما گاندھی کے افکار ونظریات اور ان کے اوصاف حمیدہ کو اپنی نثر وشاعری میں پیش کرتے ہوئے قوم وملت کی رہ نمائی، اصلاح، قومی یکجہتی اور ہندوستان کی قدیم روحانی وتہذیبی ورثہ سے محبت وعقیدت کے جذبے کو بیدار کرنے کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔ (ص:۶۶)

لیکن ادبی تحقیق اور سمینار کی سطح پر گاندھی جی کو موضوع بنانے کا مبارک خیال غالباً سب سے پہلے شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے متحرک وفعال چیرمین مولانائے محترم ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی کو آیا۔ انہوں نے عصر حاضر میں مہاتما گاندھی کی افکار ونظریات اور تعلیمات کی ضرورت افادیت کو محسوس کرتے ہوئے گاندھی جی کے ۱۵۰ ویں یوم پیدائش ۲/اکتوبر ۲۰۱۹ء کو ٹرسٹ کے زیر اہتمام اردو گھر مغل پورہ حیدرآباد میں یک روزہ سمینار بعنوان ''گاندھی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں'' منعقد کیا۔

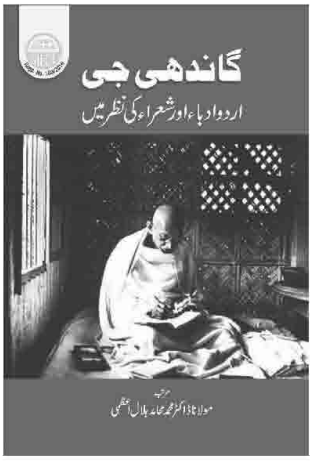

زیر تبصرہ کتاب اسی سمینار میں پیش کئے گئے مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے، جو حال ہی میں ٹرسٹ کے زیر اہتمام زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر ہمارے ہاتھوں میں آئی ہے۔ اس میں چوبیس مقالات ومضامین شامل ہیں۔ شروع میں اپنی باتیں کے عنوان سے مرتب ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے سیر حاصل مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں ٹرسٹ کی علمی وادبی سرگرمیوں کے علاوہ گاندھی جی کی تعلیم وتربیت، سماجی وسیاسی سرگرمی، آزادی کی جدوجہد اور ان کے فلسفے کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف اور عصرِ حاضر کی جدید تحریکات پر گاندھی اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو ادب میں مہاتما گاندھی کے اوصاف اور گاندھیائی افکار پر پروفیسر مجید بیدار صاحب نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنے بیش قیمت مقالہ میں اردو کی افسانوی اور غیر افسانوی گاندھیائی افکار کے مختلف گوشوں کا

احاطہ کیا ہے، جبکہ پروفیسر مظفر علی شہ میری اور ڈاکٹر نہال افروز نے گاندھی جی کی لسانی پالیسی کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ گاندھی جی کی تعلیمی افکار و نظریات اور دورِ حاضر میں اس کی معنویت پر پروفیسر محمد محمود صدیقی اور محمد منتظم نے مختصر اور جامع بحث کی ہے۔ ڈاکٹر نصرت مینو نے اردو شعراء کی نظر میں مہاتما گاندھی کو موضوع بنایا ہے، جبکہ تین مضامین اور بچوں کے ادب سے متعلق ہیں، جن کو تحریر کرنے والے راقم الحروف کے علاوہ مولانا انصار احمد معروفی اور ڈاکٹر جرار احمد ہیں۔

ان کے علاوہ مختلف شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی نظر میں گاندھی جی کی سیرت و شخصیت کو پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر حمیرہ تسنیم، ڈاکٹر رفیعہ نسیم، ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر سمی تمکین، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر عبدالقدوس، غوثیہ بانو، ڈاکٹر کفیل احمد، ڈاکٹر ناظر احمد خان، آصفہ شمیم، ابوہریرہ یوسفی، اسریٰ تسنیم، تبسم آراء اور صالحہ صدیقی شامل ہیں۔ آخری مضمون ثمینہ یاسمین نے The Mahatma کے عنوان سے انگریزی میں تحریر کیا ہے۔

آخر میں آنند نرائن ملا، اقبال سہیل، شمیم کرہانی، یحییٰ اعظمی، منظر بھوپالی اور صوفی خیرالدین شاہ کی بابو سے متعلق نظمیں مع تعارفِ شعراء شامل کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا مطالعہ اہلِ ادب و سیاست اور نئی نسل کی زندگیوں میں روشنی، روحانیت اور بصیرت افروز ثابت ہوگا۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی و غیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی و ناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661